تدبرِ قرآن

۵۰
قٓ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ قٓ سے سورتوں کا چھٹا گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں کل سترہ سورتیں ہیں۔ جن میں سے سات سورتیں ——— قٓ، ذاریات، طور، قمر، نجم، رحمان اور واقعہ — بالترتیب مکی ہیں۔ صرف سورۂ رحمان کو بعض مصاحف میں مدنی ظاہر کیا گیا ہے، لیکن اس کی تفسیر سے واضح ہو جائے گا کہ یہ رائے بالکل بے بنیاد ہے۔ پوری سورہ کا مدنی ہونا تو درکنار اس کی کوئی ایک آیت بھی مدنی نہیں ہے۔

سورۂ واقعہ کے بعد دس سورتیں ——— حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون تغابن، طلاق اور تحریم ——— مدنی ہیں۔

اس گروپ کا جامع عمود بعث اور حشر و نشر ہے۔ اس کی تمام مکی سورتوں میں یہ مضمون ابھرا ہوا نظر آئے گا۔ اگرچہ قرآن کے بنیادی مطالب، دوسرے گروپوں کی طرح، اس میں بھی زیر بحث آئے ہیں لیکن وہ اسی جامع عمود کے تحت آئے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جو مدنی سورتیں اس میں شامل ہیں وہ بھی اسی اصل کے تحت ہیں۔ بعث اور حشر و نشر پر ایمان کا لازمی نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت ہے۔ مدنی سورتوں میں اسی تسلیم و اطاعت کے وہ مقتضیات بیان ہوئے ہیں جن کے بیان کے لیے زمانۂ نزول کے حالات داعی ہوئے ہیں۔

مکی سورتوں میں تمام رد و قدح کفارِ قریش کے عقائد و مزعومات پر ہے اور وہی ان میں اصلاً مخاطب بھی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے اگر خطاب ہے تو بطور التفات و تسلی ہے۔ مدنی سورتوں میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کی کمزوریاں زیر بحث آئی ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن ایمان کے تقاضوں سے ابھی اچھی طرح آشنا نہیں ہوئے تھے۔ انہی کے ضمن میں اہل کتاب بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس دور میں اہل کتاب بھی قریش کی حمایت اور اسلام کی مخالفت کے لیے میدان

میں اتر آئے تھے، دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر منافقین کا گروہ جو گھس آیا تھا وہ بیشتر انہی اہل کتاب کے زیر اثر تھا۔

اس گروپ کی پہلی سورہ ـــــ قٓ ـــــ ہے۔ اب اللہ کا نام لے کر ہم اس کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

ب۔ سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود بعثت یعنی زندگی بعد الموت کا اثبات ہے۔ قرآن نے جب لوگوں کو آگاہ کیا کہ مرنے کے بعد لوگ از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے اور اپنے رب کے آگے اپنے اعمال و اقوال کی جوابدہی کے لیے پیش ہوں گے تو یہ چیز قریش کے لیڈروں پر بہت شاق گزری کہ انہی کے اندر کا ایک شخص مدعیٔ نبوت بن کر ان کو اس بات سے ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد لوگ پھر زندہ کیے جائیں گے۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد لوگ از سرِ نو زندہ ہوں! اس سورہ میں لوگوں کے اسی استبعاد کو موضوع بحث بنا کر ان کے شبہات کے جواب دیے گئے ہیں۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱ - ۵) قرآن کی عظمت و رفعت شاہد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو لوگ اس کو شاعری یا کہانت کے قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں، یہ انکارِ قیامت کے لیے انھوں نے ایک بہانہ تلاش کیا ہے۔ ان کو تعجب اس بات پر ہے کہ انہی کے اندر سے ایک شخص اٹھ کر انھیں ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد جب وہ سڑ گل کر مٹی ہو جائیں گے تو از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے۔ یہ بات ان کے نزدیک بہت مستبعد ہے۔ وہ قرآن کو استکبار کی بنا پر ماننا نہیں چاہتے، اس وجہ سے اس کو کہانت اور شاعری قرار دیتے ہیں۔ یہ کہانت و شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس کو جھٹلا کر وہ ایک شدید قسم کی ذہنی الجھن اور ایک کھلے ہوئے تناقض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مرنے کے بعد زمین ان کے جن اجزاء کو تحلیل کرتی ہے اللہ نے ان کو بھی جان رکھا ہے اور لوگوں کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے اس کے پاس ایک رجسٹر بھی ہے۔

(۶ - ۱۱) آسمان و زمین کی ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی شہادت دے رہی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین میں اسی لیے ودیعت فرمائی ہیں کہ جن کے اندر خشیت و انابت ہو وہ ان سے یاد دہانی و رہنمائی حاصل کریں۔ یہ نشانیاں مرنے کے بعد دوبارہ

اٹھائے جانے کو بھی ثابت کر رہی ہیں اور ان سے جزاء و سزا اور توحید کی معرفت بھی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(۱۲-۱۴) کفارِ قریش کو تہدید کہ استکبار میں مبتلا ہو کر ایک واضح حق کی تکذیب نہ کرو۔ تم سے پہلے جن قوموں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی ان پر اللہ کی وعید پوری ہو کے رہی۔ اگر انہی کی چال تم چلو گے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام ان سے مختلف ہو۔

(۱۵-۱۸) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب کتاب پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق اور صفتِ علم سے استدلال اور لوگوں کے افعال و اقوال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے اس نے جو اہتمام کر رکھا ہے اس کی طرف اشارہ۔

(۱۹-۳۵) قیامت کی تصویر۔ مکذبین کو جن حالات سے سابقہ پیش آئے گا ان کی تفصیل۔ قیامت پر ایمان رکھنے والوں کو اس روز جو سرفرازی حاصل ہوگی اس کا بیان۔

(۳۶-۳۷) قریش کو تنبیہ و تہدید کہ اپنی قوت و شوکت پر زیادہ نہ اتراؤ اور اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ ان پر زوال نہیں آسکتا، تم سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جو تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ اللہ نے ان کو عین ان کے دورِ عروج میں پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ خدا کی زمین، اپنی وسعتوں کے باوجود، ان کے لیے تنگ ہو گئی۔ ان سرگزشتوں میں ان لوگوں کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے جن کے پاس عبرت پذیر دل اور سننے والے کان ہیں۔

(۳۸-۴۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین۔ حصولِ صبر کے لیے اہتمامِ نماز کی تاکید۔ مخالفین کے معاملے کو اس دن پر محمول کرنے کی ہدایت جس کا ظہور لازمی ہے۔ اس امر کی وضاحت کہ آپ کی ذمہ داری انذار تک محدود ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ایمان اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ بس اسی قرآن کے ذریعہ سے ان لوگوں کو آگاہ کر دیجیے جو اللہ کی وعید سے ڈرنے والے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے تو اس کے نتائج سے خود دوچار ہوں گے۔

سُوْرَةُ قٓ (۵۰)

مَكِّيَّةٌ —— آیات: ۴۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۵

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (۱) بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ
مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (۲) ءَاِذَا مِتْنَا
وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ (۳) قَدْ عَلِمْنَا مَا
تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۴) بَلْ كَذَّبُوْا
بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ (۵) اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا
اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ
فُرُوْجٍ (۶) وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا
فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (۷) تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ
مُّنِيْبٍ (۸) وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ
جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ (۹) وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ
نَّضِيْدٌ (۱۰) رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ
الْخُرُوْجُ (۱۱) كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ

وَثَمُوْدُ ﴿۱۲﴾ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿۱۳﴾ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾ ع ۱۵

ترجمۂ آیات ۱-۱۵

یہ سورۂ قٓ ہے۔ قسم ہے باعظمت قرآن کی! بلکہ ان لوگوں کو تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی کے اندر سے ایک آگاہ کرنے والا آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ تو ایک نہایت عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ لوٹائے جائیں گے! یہ لوٹایا جانا تو بہت بعید ہے! ۱-۳

ہم نے جان رکھا ہے جو کچھ زمین ان کے اندر سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک محفوظ رکھنے والی کتاب بھی ہے۔ بلکہ انھوں نے حق کو جھٹلایا ہے جب کہ وہ ان کے پاس آچکا ہے۔ پس وہ ایک صریح تضادِ فکر میں مبتلا ہیں۔ ۴-۵

کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، کس طرح ہم نے اس کو بنایا اور اس کو سنوارا اور کہیں اس میں کوئی رخنہ نہیں! اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں اگائیں، ہر متوجہ ہونے والے بندے کی بصیرت اور یاددہانی کے لیے! اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا جس سے ہم نے باغ بھی اگائے اور کاٹی جانے والی فصلیں بھی۔ اور کھجوروں کے بلند و بالا درخت بھی جن میں تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں، بندوں کی روزی کے لیے۔ اور ہم نے اس سے مُردہ زمین کو زندہ کر دیا۔ اسی طرح مرنے کے بعد زمین سے نکلنا بھی ہوگا۔ ۶-۱۱

ان سے پہلے قوم نوح، اصحاب الرس، ثمود، عاد، فرعون اور لوط کے بھائیوں اور اصحب الایکہ اور قوم تبّع نے بھی جھٹلایا۔ ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو ہماری وعید ان پر واقع ہو کر رہی۔ کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز رہے! بلکہ یہ لوگ از سر نو پیدا کیے جانے کے باب میں مبتلائے شک ہیں۔ ۱۲-۱۵

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (۱)

قرآن اپنی حقانیت پر خود گواہ ہے

'قٓ' اس سورہ کا نام ہے۔ مبتداء، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں، یہاں بھی محذوف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ سورہ قٓ ہے۔

'مَجِیْدٌ' کے معنی بزرگ، برتر اور باعظمت کے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے اور قرآن کی صفت کے طور پر بھی۔ ہر کلام متکلم کی صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جس طرح اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر ہے اسی طرح اس کا کلام بھی بزرگ و برتر ہے اور یہ برتری و بزرگی قرآن کی ایک ایک آیت سے نمایاں ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی صاحب ذوق قرآن کو سنے یا پڑھے اور اس کی عظمت و شوکت سے متاثر و مرعوب نہ ہو۔ اگر کوئی اس کی عظمت و جلالت سے متاثر نہ ہو تو وہ یا تو نہایت ہی بلید ہے یا اس کا دل بالکل سیاہ ہو چکا ہے۔ آدمی تو درکنار اگر یہ قرآن پہاڑوں پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے، اللہ تعالیٰ کی خشیت سے پاش پاش ہو جاتے۔

'وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ' جملہ قسمیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس باعظمت و برتر کتاب کی قسم کھائی ہے اور قسم سے متعلق ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ قرآن میں اس طرح کی تمام قسمیں بطور شہادت ہیں۔ یعنی قسم مقسم علیہ پر دلیل کی حیثیت سے کھائی جاتی ہے۔ یہ قسم بھی مقسم علیہ پر دلیل ہے، اگرچہ وہ محذوف ہے۔ مقسم علیہ ان مواقع میں حذف کر دیا جاتا ہے جہاں کلام کا سیاق و سباق اس کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہو۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ صٓ میں موجود ہے۔ فرمایا ہے: 'صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ' (۱-۲) (اس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد پنجم، صفحات: ۵۰۹-۵۱۰) تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے

کہ یہاں قرآن کی عظمت و جلالت کی قسم ان لوگوں کی تردید میں کھائی گئی ہے جو اس کو شاعری، کہانت سحر یا القائے شیطانی کے قسم کی چیز قرار دیتے تھے۔ قرآن کی عظمت، شہادت میں پیش کر کے ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ یہ اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اپنے وجود سے شاہد ہے کہ اس کا منبع یہ سفلی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی ہے جس کا ذریعہ جبریل امین ہیں، اور جس کا منبع لوح محفوظ ہے۔ بعینہٖ اسی قسم کے سیاق و سباق کے ساتھ سورۂ بروج میں فرمایا ہے:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۲۱-۲۲)	بلکہ یہ باعظمت قرآن ہے اور اس کا منبع لوحِ محفوظ میں ہے۔

یہی بات سورۂ تکویر میں یوں فرمائی گئی ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ	یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔
ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ	وہ قوت والا اور عرش کے مالک کے نزدیک
مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ؕ	بارسوخ ہے۔ وہ مطاع اور مزید برآں امانتدار
وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۚ	ہے۔ اور تمہارا ساتھی کوئی دیوانہ نہیں ہے اور
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۚ	اس نے اس کو بالکل کھلے افق میں دیکھا ہے۔
وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۚ وَمَا هُوَ	اور وہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے،
بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ فَاَيْنَ	اور یہ کسی شیطان رجیم کا القاء نہیں ہے،
تَذْهَبُوْنَ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ	تو کہاں بھٹکے جاتے ہو! یہ تو دنیا والوں کے
لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ (۱۹-۲۷)	لیے یاددہانی ہے۔

قرآن کی عظمت کے اسی پہلو کی طرف لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حٰمٓ السجدۃ : ۴۲) (باطل نہ اس کے آگے سے اس میں آسکتا اور نہ اس کے پیچھے سے) اور لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعۃ : ۷۹) (اور اس کو صرف پاکیزہ ہی لوگ چھوتے ہیں) اور اس مضمون کی دوسری آیتیں بھی اشارہ کر رہی ہیں۔ سورۂ شعراء کے آخر میں قرآن کو کہانت اور شاعری کی تہمت سے بری کرنے کے جو دلائل بیان ہوئے ہیں ان کی وضاحت سورہ کی تفسیر میں ہو چکی ہے، خاص طور پر وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ (الشعراء : ۲۱۰-۲۱۱) کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کے انذارِ قیامت کو یہ بہانہ بنا کر نظر انداز کر رہے ہیں کہ یہ وحی الٰہی نہیں بلکہ القائے شیطانی ہے ان کی تردید کے لیے قرآن کی معجزانہ بلاغت اور اس کی لاہوتی حکمت ہی کافی ہے۔ نادان ہیں وہ جو اس کو کسی جن یا شیطان کا کلام سمجھتے ہیں۔ یہ جن

یا شیطان کا کلام نہیں بلکہ خدائے عزیز و حکیم کا اتارا ہوا کلام ہے۔

بو بہر جام جم از کان جہان دگر است

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۚ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ (۲-۳)

مخالفین کی مخالفت کی اصل علت

یہاں 'بَلْ' اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن نے اس اعتراض کو محض حقیقت سے فرار کے لیے ایک بہانہ قرار دیا ہے۔ اس 'بَلْ' کے مضمرات کھولیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جو لوگ قرآن کو جنات و شیاطین کا القاء قرار دیتے ہیں ان کی تردید کے لیے قرآن کی عظمت و جلالت ہی کافی ہے۔ ان کے فرار کی اصل وجہ وہ نہیں ہے جو وہ ظاہر کر رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ان کو اس بات پر تعجب ہے کہ ایک شخص انہی کے اندر سے ان کے لیے منذر بن کر اٹھا جو ان کو اس بات سے ڈرا رہا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اپنے اندر ہی کے ایک آدمی کو خدا کا رسول تسلیم کر لینا چونکہ ان کے دلوں پر بہت شاق ہے، اس وجہ سے اس کی تکذیب میں انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ مر کر، سڑ گل جانے کے بعد لوگ اٹھائے جائیں گے! یہ اٹھایا جانا بہت بعید از عقل ہے! اس آیت پر اچھی طرح غور کیجیے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ قرآن کے نزدیک ان کے اس فرار کی اصل علت ان کا استکبار ہے۔ وہ اپنے ہی اندر کے ایک شخص کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس وجہ سے وہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کے بھی منکر ہیں اور قیامت کو بھی ایک بعید از قیاس چیز قرار دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ استکبار میں مبتلا نہ ہوتے تو وہ اتنے بلید نہیں ہیں کہ اللہ کے کلام اور کاہنوں کی خرافات میں امتیاز نہ کر سکیں۔ اور قیامت کے اثبات کے جو دلائل قرآن ان کے سامنے پیش کر رہا ہے ان کو سمجھنے سے قاصر رہ جائیں۔

اس استکبار کی تفصیل پیچھے کی سورتوں میں گزر چکی ہے کہ یہ لوگ اول تو اپنی ہدایت کے لیے کسی رسول کی ہدایت کے قائل ہی نہیں ہیں اور اگر کسی درجے میں قائل ہیں بھی تو ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو وہ کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتا یا مکہ اور طائف کے سرداروں میں سے کسی کو رسول بناتا۔ ان سرداروں کے ہوتے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو رسول بنا دے جو ایک بالکل غریب آدمی ہے۔

ان اعتراضوں کے جواب پیچھے کی سورتوں، بالخصوص چوتھے گروپ میں جس کا جامع عمود اثباتِ رسالت ہے اور جو الفرقان سے شروع ہوتا ہے، تفصیل سے دیے جا چکے ہیں۔ یہاں گروپ کے مضمون کے تقاضے سے ان کے ان شبہات سے تعرض کیا ہے جو وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے

جانے کے امکان پر وار کرتے تھے اور جن کو قرآن اور رسول کی مخالفت کے لیے، جیساکہ اوپر ہم نے اشارہ کیا انھوں نے بہانہ بنا رکھا تھا۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۴)

مخالفین کے شبہات کا جواب

فرمایا کہ دوبارہ زندہ کیا جانا اس وجہ سے ان کو بعید از امکان معلوم ہو رہا ہے کہ جسموں کے سڑ گل کر خاک میں مل جانے کے بعد ان کے اجزار کو زمین کی تہوں سے فراہم کرنا، ان کے خیال میں، ناممکن ہے۔ یہ مغالطہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے علم کو اپنے علم پر قیاس کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جسم انسانی کے جن اجزاء کو زمین تحلیل کرتی ہے، وہ ان سب کو جانتا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ جس نے ہر چیز کو خلق کیا ہے اور جس کے حکم ہی سے ہر چیز پر موت طاری ہوتی ہے، اس سے کوئی چیز کس طرح مخفی رہ سکتی ہے! 'اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (الملک: ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے؟) اور جب وہ جانتا ہے تو جب وہ چاہے گا ان تمام اجزا کو فراہم کر کے ہر ایک کے جسم کو از سرِ نو متشکل کر دے گا۔ اس کام میں اس کو ذرا بھی دشواری نہیں پیش آئے گی۔ جس نے ہر چیز کو عدمِ محض سے وجود بخشا اور اس کو اس میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، آخر دوبارہ اس کے منتشر اجزار کو اکٹھا کر دینے میں اس کو کیوں دشواری پیش آئے گی؟

'وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ'۔ یعنی اپنے ذاتی علم کے سوا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا سارا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے ایک دفتر بھی قائم کر رکھا ہے۔ جس میں یہ بھی درج ہے کہ کون شخص زمین کی کس پہنائی میں دفن ہے اور اس کے جسم کے اجزاء کہاں کہاں ہیں اور ہر شخص کے تمام اقوال و افعال بھی اس میں درج ہیں۔ نادانوں کو قیامت کے باب میں جس طرح یہ شبہ پیش آتا ہے کہ سڑ گل کر مٹی میں مل جانے کے بعد جسمِ انسانی کے اجزار کو فراہم کرنا اور ان کو از سرِ نو جسم کی شکل میں متشکل کرنا بھلا کس کے بس میں ہے اسی طرح یہ شبہ بھی پیش آتا ہے کہ ہر شخص کے ہر قول و فعل کا ریکارڈ کون محفوظ رکھ سکتا ہے کہ ایک دن وہ سب کا حساب کرنے اور سب کو سزا اور جزا دینے بیٹھے؟ اس ٹکڑے نے اس شبہے کو بھی صاف کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے تمام اقوال و اعمال کا ریکارڈ بھی ایک دفتر میں محفوظ کر رکھا ہے۔

یہ ریکارڈ محفوظ رکھنے کا معاملہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے لیے تو اچنبھے کا ہو سکتا تھا۔ لیکن اس زمانے میں سائنس نے جو انکشافات کیے ہیں ان کو جاننے کے بعد، اگر کوئی شخص قرآن کے اس دعوے میں شک کرے تو ایسے ہٹ دھرموں کو کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی قائل نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اس وقت مانیں گے جب ان کے ہاتھوں میں ان کے اعمال نامے پکڑا دیے جائیں گے۔

لیکن اس وقت کا ماننا بالکل بے سود ہوگا۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ (۵)

لفظ 'حق' اسی سورہ کی آیت ۱۹ اور آیت ۴۲ میں قیامت کے لیے آیا ہے لیکن یہاں 'لَمَّا جَاءَهُمْ' کا قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے جو قیامت سے لوگوں کو آگاہ کر رہا تھا لیکن لوگ اس کی تکذیب کر رہے تھے اور اس کی تکذیب کے لیے بہانہ کے طور پر قیامت کے خلاف وہ شبہات پیش کر رہے تھے جو اوپر بیان ہوئے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے ان شبہات سے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ گویا قیامت فی الواقع ایک بہت بعید از امکان چیز ہے اور یہ اس کا انکار جو کر رہے ہیں تو اس کے لیے معقول وجوہ ان کے پاس ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ایک بالکل بدیہی حق کی تکذیب کی ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ ان کے سامنے بالکل واضح طور پر آ گیا۔

'لَمَّا جَاءَهُمْ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ قرآن مجید جس قیامت کی خبر دے رہا ہے وہ حق تو پہلے بھی تھی لیکن اب تک یہ لوگ اس کے باب میں اگر گرفتار شبہات رہے تو ان کے پاس کچھ عذر بھی تھا کہ یہ قرآن و کتاب سے ناآشنا اُمّی تھے لیکن اب وہ کیا عذر کر سکتے ہیں جبکہ وہ ایک ایسے حق کا انکار کر رہے ہیں جو نصف النہار کے سورج کی طرح ان کے سروں پر چمک رہا ہے!

مکذبین قیامت کا تضادِ فکر

'فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ'۔ 'امرِ مریج' کی تشریح اہلِ لغت 'امرِ مختلط' یا 'امرِ ملتبس' کے الفاظ سے کرتے ہیں، یعنی ایک ایسی صورتِ حال جس میں نہایت واضح قسم کا تناقض و تضاد ہو۔ 'مرج' کے معنی 'خلط' یعنی گڈمڈ کر دینے کے ہیں۔ سورۂ رحمان میں ہے۔ 'مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ' (۱۹) (اس نے کھاری اور شیریں دونوں قسم کے دریا چھوڑے جو آپس میں ٹکراتے ہیں)۔ قرآن کی تکذیب کر کے مکذبین جس صورتِ حال سے دوچار ہوئے یہ اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر ہے کہ یہ لوگ ایک صریح قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا ہو کے رہ گئے ہیں۔ ایک طرف یہ خدا اور اس کی ان تمام صفات کا اقرار کرتے ہیں جو قیامت کو لازم کرتی ہیں، دوسری طرف قیامت کا انکار کرتے ہیں جو اس اقرار کا بالکل بدیہی تقاضا ہے۔ اس طرح وہ ایک ایسی ذہنی الجھن میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ ان کو سجھائی نہیں دے رہی ہے۔ اس الجھن سے نجات کی واحد راہ وہی ہے جو قرآن ان کو بتا رہا ہے، لیکن اس کو قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہیں حالانکہ حق کی تکذیب کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آدمی اپنی تکذیب کو جائز ثابت کرنے کے لیے جتنی دلیلیں ایجاد کرتا ہے وہ سب اس کے موقف کے بودے پن کو عریاں کرتی ہیں۔ قرآن نے ان کے اسی تضادِ فکر کی طرف سورۂ ذاریات میں، جو اس کی توام سورہ ہے 'إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ' (۸) (بے شک تم لوگ

ایک شدید قسم کے تناقض میں گرفتار ہو) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ اس مسئلہ کی پوری وضاحت سورۂ نمل کی آیت ۶۶ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ... الآیۃ کے تحت ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان کی گمراہی میں سب سے زیادہ دخل اس کے اسی تضادِ فکر کو ہے۔ یا تو وہ اپنی سہل انکاری کے سبب سے رطب و یابس ہر قسم کے نظریات اپنے ذہن میں جمع کر لیتا ہے یا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں صحیح نظریات و عقائد کے ساتھ باطل نظریات بھی جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی زندگی مجموعۂ اضداد بن جاتی ہے۔ اگر انسان اپنے افکار کا برابر جائزہ لیتا رہے، تنقید کی صلاحیت مردہ نہ ہونے دے، اور خواہشاتِ نفس کی پیروی میں حق کے ساتھ باطل کا جوڑ ملانے کی کوشش نہ کرے تو وہ شیطان کے اس فتنہ سے محفوظ رہ سکتا ہے لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔

أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ ۝ وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ (۶-۸)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی طرف اشارہ

یہ اللہ تعالیٰ نے مکذبینِ قیامت کو اپنی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی ان بدیہی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اوپر اور نیچے ہر جگہ نظر آتی ہیں اور ہر اس شخص کے اندر بصیرت اور یاددہانی پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں جس کے سینہ میں اثر پذیر اور متوجہ ہونے والا دل ہو۔

سب سے پہلے اپنی عظیم قدرت و حکمت کی طرف توجہ دلائی کہ کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی کہ دیکھتے کہ کس طرح ہم نے اس کو بلند کیا، اس کو ستاروں سے سجایا اور ہماری قدرت و حکمت کا اعجاز ہے کہ ایسی ناپیدا کنار چھت میں کہیں کسی رخنہ کی نشان دہی وہ نہیں کر سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کی قدرت و حکمت کا یہ کرشمہ وہ اپنے سروں پر دیکھتے ہیں، کیا اس کے لیے ان کے مرنے کے بعد ان کو دوبارہ پیدا کر دینا مشکل ہو جائے گا؟

اس کے بعد قدرت و حکمت کے ساتھ اپنی ربوبیت اور پرورش کے اہتمام کی طرف بھی توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہ اپنے نیچے دیکھیں کہ کس طرح ہم نے زمین کو ان کے قدموں کے نیچے بچھایا ہے اور اس کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے اندر پہاڑوں کی میخیں گاڑ دی ہیں اور اس میں طرح طرح کی چیزیں اُگا رکھی ہیں جو ان کی غذا کے کام آتی ہیں اور جن کی خوش منظری ان کی باصرہ نوازی بھی کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کی قدرت و حکمت اور جس کی پروردگاری کی یہ نشانیں وہ دیکھ رہے ہیں کیا اس کے لیے دشوار ہے کہ وہ ان کے مرجانے کے بعد، ان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے؟ کیا

جس پروردگار نے ان کی پرورش کا یہ اہتمام کر رکھا ہے وہ ان کو اسی طرح چھوڑے رکھے گا کہ وہ کھائیں پئیں، عیش کریں، ان سے کبھی اس باب میں کوئی پرسش نہیں ہو گی۔

یہ دنیا اپنے وجود میں ایک درس گاہ معرفت ہے

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کے اندر اپنی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی یہ شانیں اس لیے نمایاں فرمائی ہیں کہ جو لوگ توجہ کرنے والے ہیں، ان کے اندر یہ بصیرت اور یاد دہانی پیدا کریں۔ 'تَبْصِرَةً' سے مراد آنکھوں کے اندر بصیرت پیدا کرنا ہے کہ وہ ظاہر سے گزر کر اس حقیقت تک پہنچ سکیں جس کی طرف ظاہر رہنمائی کر رہا ہے۔ اور 'ذِكْرٰى' سے مراد غفلت کے حجاب کو دور کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کے چپہ چپہ کو ایسے عجائب اور کرشموں سے بھر دیا ہے جو آنکھوں کے پردے اٹھانے اور دلوں کے جھنجھوڑنے اور جگانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن یہ کرشمے ان پر کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر اثر پذیری کی حس موجود ہو۔ جو لوگ اپنی محسوس پرستی کی وجہ سے اپنی یہ حسِ لطیف مردہ کر چکے ہوں ان کے لیے یہ ساری کائنات ایک عالمِ ظلمات ہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی طرف اس کتاب میں جگہ جگہ، ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام رنگا رنگیوں اور گل کاریوں کی محتاج نہیں تھی جو اس کے ہر گوشے میں نمایاں ہیں، لیکن قدرت نے اس فیاضی کے ساتھ اس کے اندر اپنی شانیں جو دکھائی ہیں تو اسی لیے دکھائی ہیں کہ انسان کی وہ حسِ لطیف جو قدرت، حکمت، حسن اور فیض و کرم سے اثر پذیر اور بیدار ہوتی ہے وہ بیدار ہو اور اس چمن کے ایک ایک پتہ پر جو درسِ حکمت ثبت ہیں وہ ان کو سیکھے اور سمجھے، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ خالق نے ہر انسان کے اندر توجہ اور انابت کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے وہ اس کو بروئے کار لائے۔ اگر کوئی شخص اپنی اس صلاحیت کو استعمال نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کو ایسے بلید و بے حس جانوروں کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس نے انسان کو ذی ارادہ ہستی جو بنایا ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جو شعور اس کو عطا ہوا ہے اس کی قدر کرے اور اس کی رہنمائی میں آگے کے لیے قدم اٹھائے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کو خدا کی طرف سے مزید روشنی عطا ہوتی ہے ورنہ جو کچھ اس کو عطا ہوتا ہے وہ بھی اس کی ناقدری کی پاداش میں سلب ہو جاتا ہے۔

ان آیتوں میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ اطمینانِ قلب اور شرحِ صدر کے لیے بعض حوالے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں، ان لوگوں کو خطاب کر کے، جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو مستبعد خیال کرتے تھے، فرمایا ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ — کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ جس اللہ نے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرآئیل : ۹۹)

آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ان کی طرح پھر پیدا کر دے۔

منکرین قیامت کے اسی شبہ کا جواب سورۂ نازعات میں ان الفاظ میں دیا ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ۞ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ۞ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ۞ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۞ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۞ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۞ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۞ (النّٰزعٰت : ۲۷-۳۳)

کیا تمھارا پیدا کیا جانا زیادہ کٹھن ہے یا آسمان کا؟ اس کو بنایا، اس کے گنبد کو بلند کیا، پھر اس کو اچھی طرح ہموار کیا، اور اس کی رات کو ڈھانک دیا اور اس کے دن کو بے نقاب کیا۔ اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ اس سے اس کا پانی اور چارہ برآمد کیا اور پہاڑوں کو لنگرانداز کیا۔ تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے برتنے کے لیے۔

ان آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان میں قدرت، عظمت، حکمت اور ربوبیت کے وہ سارے پہلو، کچھ مزید وسعت کے ساتھ، سمٹ آئے ہیں، جن سے سورۂ قٓ کی زیر بحث آیات میں قیامت کے وقوع، اس کی ضرورت اور اس کے مقتضائے صفات الٰہی ہونے پر استدلال فرمایا گیا ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۞ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۞ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (۹-۱۱)

آسمان وزمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ ایک اور پہلو سے

یہ آسمان وزمین کی نشانیوں کی طرف ایک اور زاویہ سے توجہ دلائی جس سے آسمان وزمین کے درمیان توافق کے پہلو سے توحید کی شہادت بھی ملتی ہے۔ ان کے اندر ربوبیت کے جو اسباب وولیعت ہیں ان سے جزا و سزا کا لزوم بھی سامنے آتا ہے اور بارش سے مردہ زمین کے اندر جو حیات تازہ نمودار ہوتی ہے اس سے حیات بعد الممات کے وقوع کا بھی مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا ہے۔

'مَآءً مُّبٰرَكًا' سے مراد وہ بارش ہے جو باعث زرخیزی وشادابی ہو۔ بعض مرتبہ ایسی بارش بھی ہوتی ہے جو زرخیزی کے بجائے تباہی کا باعث بن جاتی ہے اور وہ قوموں کے لیے عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں 'مبارک' کی صفت اسی شبہ کے ازالہ کے لیے ہے۔

'حَبَّ الْحَصِيْدِ' سے وہ اجناس مراد ہیں جن کا دروعمل میں آتا ہے اور جو ذخیرہ کی جاتی ہیں مثلاً گندم اور جو وغیرہ۔ باغوں کے ساتھ 'حَبَّ الْحَصِيْدِ' کے ذکر سے مقصود اس اہتمام ربوبیت کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس کائنات کے رب نے اپنے بندوں کے لیے فرمایا ہے کہ اس نے لوگوں

رہا تھا! اور صور پھونکا جائے گا۔ وہ ہماری وعید کے ظہور کا دن ہوگا۔ اور ہر جان اس طرح حاضر ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہوگا اور ایک گواہ۔ تو اس سے غفلت میں پڑا رہا تو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ ہٹا دیا تو آج تو تیری نظر بہت تیز ہے! اور اس کا ساتھی کہے گا، یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے۔ تم جھونک دو جہنم میں ہر ناشکرے، معاند، خیر سے روکنے والے، حدود کو توڑنے والے، مبتلائے شک کو، جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود ٹھہرائے تو ڈال دو اس کو سخت عذاب میں۔ ۱۹-۲۶

اس کا ساتھی شیطان کہے گا، اے ہمارے رب میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود نہایت دور کی گمراہی میں پڑا رہا۔ ارشاد ہوگا، اب میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں نے پہلے ہی تمہیں اپنی وعید سے آگاہ کر دیا تھا۔ میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ ۲۷-۲۹

اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم جہنم سے پوچھیں گے، کیا تو بھر گئی! اور وہ جواب دے گی کہ ابھی اور بھی ہیں! اور جنت متقیوں کے قریب لائی جائے گی، ذرا سنا لیکہ دور نہ ہوگی۔ یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر رجوع کرنے والے اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے کے لیے جو خدائے رحمان سے ڈرا غیب میں، اور حاضر ہوا متوجہ رہنے والے دل کے ساتھ۔ داخل ہو جاؤ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ! یہ ہمیشگی کا دن ہے۔ ان کو ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔ ۳۰-۳۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۱۶)

اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے

قیامت کے باب میں جہاں نادانوں کو یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ انسان کے مرکھپ جانے اور زمین میں رل مل جانے کے بعد اس کے تمام اجزائے جسم کو فراہم کرنا اور از سرِ نو زندہ کر کے کھڑا کر دینا بھلا کس کے بس میں ہے اسی طرح یہ شبہ بھی بہتوں کو لاحق ہوتا ہے کہ ایک ایک شخص کے خلوت و جلوت کے تمام اقوال و افعال کا ریکارڈ کون رکھ سکتا ہے کہ ایک دن سب کا حساب کرنے بیٹھے اور ہر ایک کو جزا و سزا دے۔ یہ دونوں شبہات بالکل توام ہیں۔ اس وجہ سے اوپر آیت ۴ میں اجمالی طور پر دونوں کا جواب دیا ہے۔ پھر تفصیل کے ساتھ پہلے شبہ کی تردید فرمائی ہے۔ اب یہ دوسرے شبہے سے تعرض فرمایا ہے اور دلائل سے اس کا جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے اور اس کے اقوال و اعمال تو درکنار اس کے دل میں جو وسوسے خطور کرتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خالق ہے، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جوڑ جوڑ، بند بند کو استوار کیا ہے تو لازم ہے کہ وہ اس کے تمام پرزوں کے دروبست اور ان کے عمل سے اچھی طرح آگاہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف دوسرے الفاظ میں یوں توجہ دلائی ہے: 'اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (الملک: ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا)۔ اگر خالق اپنی مخلوق کی تمام جزئیات سے باخبر نہ ہو تو وہ اس کی حفاظت اور اس کے بقاء کا انتظام کس طرح کرے گا؟

'وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ'۔ 'وَرِيْدٌ' رگِ جاں کو کہتے ہیں۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف محاورہ ہے جو غایت درجہ قرب کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ فرمایا کہ کوئی شخص اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اگر وہ ہم کو نہیں دیکھ رہا ہے تو ہم اس سے دور ہیں۔ ہم ہر شخص کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ ہمارا علم اور ہماری قدرت ہر شخص کا ہر پہلو سے احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کا تمام ظاہر و باطن ہر لمحہ ہماری نگاہوں میں ہے۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (۱۷-۱۸)

لوگوں کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھنے کے لیے مزید اہتمام

'عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ' میں تالیفِ کلام یوں ہے: 'عن الیمین قعید وعن الشمال قعید' (ایک داہنے بیٹھا ہوا، دوسرا بائیں بیٹھا ہوا) عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق بتقاضائے ایجاز ایک جگہ لفظ 'قَعِيْدٌ' محذوف ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہ اس مزید اہتمام کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اقوال و اعمال کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لیے کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اول تو بذاتِ خود ہر شخص کے وساوس و خطراتِ قلب تک سے اچھی طرح باخبر ہے، مزید برآں اس نے اتمامِ حجت کے لیے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ ہر شخص پر دو دو فرشتے مامور کر رکھے ہیں۔ جن میں سے ایک اس کے دہنے بیٹھا ہوتا ہے، دوسرا بائیں۔ جو بھی وہ کوئی لفظ بولتا ہے اپنے پاس ایک مستعد نگران اس کو نوٹ کرنے کے لیے حاضر پاتا ہے۔

یہاں اعمال کے نوٹ کیے جانے کا ذکر اگرچہ لفظوں میں نہیں ہے لیکن وہ علی سبیل التغلیب اس میں داخل سمجھے جائیں گے، اس لیے کہ جب زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کے نوٹ کیے جانے کے لیے یہ اہتمام ہے تو ہاتھ پاؤں سے انجام دیے ہوئے اعمال کے نوٹ کیے جانے کا اہتمام تو بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہیے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں فرشتوں میں تقسیم کار ہے۔ جو فرشتہ دائیں جانب مامور ہوتا ہے وہ نیک اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ جو بائیں طرف ہوتا ہے وہ برے اعمال و اقوال کا ریکارڈ رکھتا ہے۔ شہادت کے معاملے میں چونکہ دو گواہوں کی گواہی دین میں معتبر مانی گئی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی دو دو فرشتے مامور فرمائے۔

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آدمی کے وساوس و خطراتِ قلب ان فرشتوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور یہ اس کی ستاری ہے کہ اس نے بندوں کے دلوں کے بھیدوں کا علم اپنے ہی تک محدود رکھا ہے۔

اتمامِ حجت کے لیے ایک اور اہتمام

اس اہتمام کے علاوہ ایک اور اہتمام بھی اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حجت کا کر رکھا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کے ہاتھ پاؤں اور کان آنکھ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کے تمام اقوال و اعمال کی گواہی دیں گے۔ ہم جو کچھ زبان سے بولتے ہیں اس کا سارا ریکارڈ ہمارے کان محفوظ کر رہے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی پوری فلم ہماری آنکھوں کی تحویل میں ہے۔ یہی حال ہمارے دوسرے اعضاء و جوارح کا ہے۔ ہم جو کچھ بھی کہتے یا کرتے ہیں سب خدا کے مامور کیے ہوئے پاسبانوں کے سامنے اور اسی کے بخشے ہوئے اعضاء و جوارح کے ذریعہ سے کرتے ہیں۔ پھر یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ایک ایک قول و فعل کو کس طرح جان سکتا ہے کہ ان کا حساب کرنے بیٹھے گا!

'اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ' میں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق 'اِذْ' سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یہاں چونکہ غافلوں کو ایک حقیقتِ نفس الامری کی یاد دہانی کی جا رہی ہے اس وجہ سے کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے گا جس سے مخاطب کو تنبہ ہو۔ یعنی دھیان رکھو، خیال رکھو۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ صاحبِ کشاف نے ایک دوسری تشکیل اختیار کی ہے، لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۱۹)

قیامت ایک شدنی ہے

'حَقٌّ' سے مراد وہی قیامت ہے جس کی قرآن خبر دے رہا تھا اور جس کی تکذیب کا ذکر اوپر آیت ۵ میں گزر چکا ہے۔ چونکہ وہ ایک شدنی اور ایک اٹل حقیقت ہے، اس وجہ سے اس کو 'حق' سے تعبیر فرمایا ہے۔ ماضی کا صیغہ اس کی قطعیت کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو بہت دُور نہ خیال کرو بلکہ ایک آئی ہوئی چیز سمجھو۔ جتنے دن زندگی کے باقی ہیں بس اتنی ہی دیر قیامت کے آنے میں ہے۔ جونہی موت کی بے ہوشی طاری ہوئی قیامت گویا اس کے ساتھ ہی لگی کھڑی ہے۔ اس وقت صورت حال خود تمھیں بتا دے گی کہ جس چیز سے تم کتراتے رہے تھے بالآخر وہ آہی گئی۔

قیامت ہر آدمی کی موت کے ساتھ لگی ہوئی ہے

قیامت، کی یہی حقیقت احادیث میں بھی بیان ہوئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے: 'مَنْ مَاتَ فقد قامت قیامتہ' (جو مرا اس کی قیامت آگئی) اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد برزخ کی جو زندگی ہے وہ درحقیقت قیامت ہی کا دیباچہ ہے۔ موت کے ساتھ ہی عالم آخرت کے احوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اہل ایمان کو ایمان کی حقانیت اور اس کے اچھے انجام کی شہادت مل جاتی ہے اور کفار کے سامنے اس انجام کے ظہور کا آغاز ہو جاتا ہے جس کی وہ دنیا کی زندگی میں تکذیب کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد کسی شک کی گنجائش کسی کے لیے بھی باقی نہیں رہ جاتی۔

قیامت کے باب میں اس کے منکروں کے رویہ کی صحیح تعبیر

'ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ' یہ بات زبانِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور قولاً بھی ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت تم دیکھ لوگے کہ جس چیز سے تم کتراتے رہے وہ بالآخر سر پر آہی دھمکی۔ 'حَادَ یَحِیْدُ' کا صحیح مفہوم راستہ سے کترا کر چلنا ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک تعبیر ہے قیامت کے باب میں ان لوگوں کے رویے کی جو اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ قیامت سے بے پروا ہو کر زندگی گزارتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ قیامت کے دلائل ان سے مخفی ہیں، اس کے آثار تو ہر قدم پر موجود ہیں لیکن جو لوگ سیدھی راہ نہیں اختیار کرنی چاہتے وہ ان سے کترا کر چلتے ہیں، لیکن اس وقت یہ کیا کریں گے جب وہ ان کے سامنے آن کھڑی ہوگی۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ (۲۰)

یعنی اس کے بعد بس نفخ صُور ہی کا مرحلہ ہے۔ صُور پھونکا جائے گا اور وہ دن ظاہر ہو جائے گا جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے اور تم اس کی تکذیب کیے جا رہے ہو۔ اس کو بھی اس کی قطعیت کے اظہار کے لیے ماضی کے صیغہ سے ادا کیا ہے تاکہ نگاہوں کے سامنے مصوّر ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ زندگی، پھر موت، پھر برزخ، پھر حشر و نشر بہت دُور کی بات ہے جب صور پھونکا جائے گا تو ایسا محسوس کرو گے کہ جس مدت کو تم بہت دراز سمجھتے تھے وہ پلک جھپکتے

گزر گئی۔

وَجَآءَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيۡدٌ (۲۱)

روزِ قیامت کی پیشی کی تصویر

یہ نفخِ صُور کے بعد کا مرحلہ ہے۔ اس دن ہر جان اپنے رب کے آگے پیشی کے لیے اس طرح حاضر کی جائے گی کہ ایک فرشتہ اس کے پیچھے سے اس کو ہانکنے کے لیے مامور ہوگا اور دوسرا اس کے اقوال و اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ گواہی کے لیے۔ یہی مفہوم آیت سے متبادر بھی ہوتا ہے اور یہی سلف سے منقول بھی ہے۔ بعض لوگوں نے 'سَآئِق' اور 'شَهِيد' دونوں سے ایک ہی فرشتہ مراد لیا ہے کہ وہی ہانک کر لائے گا بھی اور وہی گواہی بھی دے گا۔ بعض لوگوں نے 'سَآئِق' سے فرشتہ کو مراد لیا ہے لیکن 'شَهِيد' سے آدمی اور اس کے عمل کو۔ یہ دونوں قول ہمارے نزدیک کمزور ہیں۔ پہلا عربیت کے پہلو سے کمزور ہے اور دوسرے میں صریح تکلّف ہے جس سے آیت کے الفاظ ابا کر رہے ہیں۔

بعض لوگوں نے انہی دونوں فرشتوں کو مراد لیا ہے جن کا ذکر اوپر آیت ۱۸ میں گزرا ہے لیکن یہ بات بھی کمزور معلوم ہوتی ہے۔ یہ دونوں فرشتے، آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ آدمی کے اقوال و اعمال لکھنے پر مامور ہوتے ہیں۔ اگر انہی کو خدا کی عدالت میں پیش کرنے کے لیے آدمی کو حاضر کرنا بھی ہے تو دونوں کی ایک ہی حیثیت ہونی چاہیے۔ یعنی دونوں گواہ کی حیثیت سے پیش ہوں۔ اس بات کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جب دونوں مامور ایک ہی حیثیت سے تھے تو ایک کی حیثیت تبدیل کیوں ہو جائے گی؟ بہرحال ان میں سے کوئی قول بھی ضعف سے خالی نہیں ہے۔ آیت کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے وہ وہی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا کہ نفخِ صُور کے بعد ہر شخص کی پیشی اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس طرح ہونی ہے کہ ایک فرشتہ اس کے پیچھے پیچھے اس کو ہانکنے کے لیے ہوگا اور دوسرا اس کے آگے آگے تمام اقوال و اعمال کے ریکارڈ کے ساتھ گواہی کے لیے۔

لَقَدۡ كُنۡتَ فِىۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا فَكَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ (۲۲)

پیشی کے وقت ایک تنبیہ

اس وقت اس کو اللہ تعالیٰ متنبہ فرمائے گا کہ اس دن سے تم غفلت میں پڑے رہے تو آج ہم نے تمہاری آنکھوں کے آگے سے پردہ ہٹا دیا۔

'فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ' یہ فقرہ اس کی تفضیح کے لیے طنز کے انداز میں ہوگا کہ آج تو تمہاری نگاہیں بہت تیز ہیں! جس چیز کا امکان تمہیں کہیں دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا آج اس کا ہر گوشہ کس طرح تمہارے آگے بے نقاب ہو گیا ہے!

یہ آیت اس آیت کے معارض نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ آیاتِ الٰہی کے انکار کرنے والے قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے۔ ان دونوں کا موقع و محل ہم واضح کر چکے ہیں۔

وَقَالَ قَرِيْنُهُ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ (۲۳)

مجرم کی پیشی عدالت میں

قرینہ دلیل ہے کہ 'قرین' سے مراد انہی دو میں سے کوئی ایک ہے جو 'سائق' اور 'شہید' کی حیثیت سے اس کو لے کر عدالتِ الٰہی میں حاضر ہوں گے۔ بعض لوگوں نے اس سے اس شیطان کو مراد لیا ہے جو اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والے پر مسلط کر دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ یہ شیطان نہ تو کسی کے بارے میں یہ کہہ سکنے کی پوزیشن میں ہوگا کہ یہ شخص جو میری تحویل میں تھا حاضر ہے، اور نہ وہ اس دن کسی کو بہکانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے گا۔ آگے اس کا قول آ رہا ہے کہ جب اس کے جال میں پھنسے ہوئے لوگ اپنی گمراہی کی ذمہ داری اس پر ڈالنی چاہیں گے تو وہ صاف اعلانِ براءت کرے گا کہ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (قٓ: ۲۷) (اے ہمارے رب! میں نے اس کو گمراہ نہیں کیا بلکہ یہ خود نہایت دور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا)۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس سے انہی دو میں سے کوئی ایک مراد ہے۔ یہ سوال کہ ان میں سے کون مراد ہے تو اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ اس سے 'شہید' بھی مراد ہو سکتا ہے اور 'سائق' بھی، اس لیے کہ یہ بات دونوں ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو میری تحویل میں تھا، حاضر ہے۔ چنانچہ اصحابِ تاویل نے اس میں اختلاف کیا بھی ہے۔ میرا رجحان اس طرف ہے کہ یہ بات 'سائق' کہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجرم اصلاً چارج میں اسی کے ہوگا اور اسی پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اس کو عدالت میں پیش کرے۔ چنانچہ جب وہ اس کو عدالت میں حاضر کر دے گا تو ایک فرض شناس سپاہی کی طرح اپنے فرض سے سبک دوشی کا اظہار ان الفاظ میں کرے گا کہ 'هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ' (یہ جو میری تحویل میں ہے، حضور کے سامنے حاضر ہے!)

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ (۲۴)

ایک سوال اور اس کا جواب

'اَلْقِيَا' تثنیہ کا صیغہ ہے اس وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم کن دو فرشتوں کو دیا جائے گا۔ عام طور پر اربابِ تاویل نے اس کا مخاطب انہی دو فرشتوں کو قرار دیا ہے جن کا ذکر اوپر 'سائق' اور 'شہید' کے الفاظ سے گزر چکا ہے۔ انہی کو حکم ہوگا کہ ہر ناشکرے معاند کو جہنم میں جھونک دو۔ اس تاویل میں بظاہر کوئی ضعف نظر نہیں آتا۔ ان دونوں کو یہ حکم دینے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہی اس کو جہنم میں ڈالیں بھی۔ یہ محض حکم کا بیان ہے۔ اس کی تعمیل میں وہ مجرم کو جہنم میں جھونکنے والے فرشتوں کے حوالہ کر دیں گے اور وہ اس کو جہنم کے اس طبقے میں، جو اس درجے کے مجرمین کے لیے خاص ہوگا، ڈال دیں گے۔

اس تثنیہ سے متعلق زمخشریؒ نے ایک قول مشہور ادیب مبرّد کا بھی نقل کیا ہے کہ فصحائے عرب تثنیہ کا صیغہ بعض اوقات مجرد تکرارِ فعل کے مفہوم کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً امرء القیس

کے قصیدے کا مطلع ہے: 'قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَىٰ حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ' اس کا ترجمہ عام طور پر تو لوگ یوں کرتے ہیں کہ "میرے دونوں ساتھیو، ٹھہرو ذرا جاناں اور منزلِ جاناں کی یاد میں دو آنسو بہالیں"۔ مبرّد کے اس قول کی روشنی میں 'قِفَا' کے معنی صرف 'ٹھہرو، ٹھہرو' کے ہوں گے۔ دو مخاطب فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح 'اَلقِیَا' کا مفہوم آیت میں اس کے نزدیک 'ڈال دو، ڈال دو' ہوگا۔ مقصود اس سے اظہارِ غضب اور تاکیدِ حکم ہے، اس سے بحث نہیں کہ یہ حکم دو فرشتوں کو دیا جائے گا یا دو سے زیادہ فرشتوں کو۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہی بات سورۂ 'حاقّہ' میں جمع کے صیغے سے بھی فرمائی گئی ہے: خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ۝ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ (۳۰-۳۲) (اس کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو، پھر اس کو دوزخ میں داخل کرو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستّر گز ہے، اس کو جکڑ دو)۔ میں نے اس قول کا حوالہ صرف غور و تحقیق کے مقصد سے دیا ہے۔ مجھے اس پر پورا جزم نہیں ہے۔ البتہ مزید تحقیق سے اس کے حق میں اطمینان بخش شواہد فراہم ہو جائیں تو اس سے بعض مشکلات کے حل میں مدد ملے گی۔ جہاں تک احوالِ آخرت کا تعلق ہے ان کے باب میں سلامتی کی راہ میرے نزدیک یہ ہے کہ الفاظِ قرآن سے جو مفہوم متبادر ہو آدمی اس پر ایمان رکھے۔ زیادہ کھوج کرید میں نہ پڑے۔

'کُلَّ کَفَّارٍ عَنِيدٍ'۔ 'کَفَّار' کے معنی ناشکرے اور منکرِ حق کے ہیں اور 'عَنِيد' کے معنی معاند کے۔ لفظ 'کفر' اصلاً خدا کی ناشکری اور اس کے حقوق کے انکار کے لیے آتا ہے۔ خدا کے حقوق میں کسی سلیم الفطرت کے لیے کسی بحث و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس وجہ سے ان کا منکر صرف کافر ہی نہیں بلکہ کفّار ہے اور اس کی اس کفّاری پر مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ ان حقوق کا معاند مخالف بن کر اٹھ کھڑا ہو کہ دوسرے بھی ان کے ادا کرنے والے نہ بن سکیں۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ۝ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ (۲۵-۲۶)

خدا کے حقوق کے منکر لازماً بندوں کے حقوق کے بھی منکر ہوں گے

جو خدا کے حقوق کے منکر و معاند ہوں گے لازماً وہ اس کے بندوں کے حقوق کے معاملے میں بھی نہایت بخیل و مُمسک اور دوسروں کو ان سے روکنے والے ہوں گے اور ساتھ ہی وہ 'معتدی' یعنی حدود سے تجاوز کرنے والے حقوق کو غصب کرنے والے بھی ہوں گے۔ لفظ 'خَیْر' یوں تو تمام نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے عام ہے لیکن انفاق کی نیکی کے لیے یہ معروف ہے جس کا تعلق بندوں سے ہے۔ لفظ 'مَنَّاع' میں رکنے اور روکنے دونوں کا مفہوم موجود ہے۔ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ صرف خود ہی بخیل بننے پر قانع نہیں رہتے بلکہ دوسروں کو بھی بخیل بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی بخیلی کا راز فاش نہ ہو۔ مزید برآں اس طرح کے لوگ 'معتدی' بھی ہوتے ہیں۔ یہ صرف اتنے

پر صبر نہیں کرتے کہ دوسروں کے جو حقوق ان کے ذمہ ہیں ان کو دبائے بیٹھے رہیں بلکہ تعدّی کر کے یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے وہ بھی ان کے پاس نہ رہنے پائے بلکہ اس کے مالک بھی یہی بن بیٹھیں۔ 'مُرِیْبٍ' کے معنی مبتلائے شک کے ہیں۔ یوں تو یہ لفظ عام ہے۔ توحید یا آخرت جس باب میں بھی شک ہو وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لیکن قرآن میں اس کا معروف استعمال اس شک کے لیے ہوا ہے جو قیامت کے بارے میں ہو، جو اس سورہ میں موضوع بحث ہے۔ یہاں اس صفت کا ذکر ان تمام صفات کی اصل کی حیثیت سے ہوا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ قیامت کے باب میں شک ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو ناشکرا، معاند، بخیل اور تعدّی کرنے والا بنا تا ہے۔ چنانچہ ان تمام بیماریوں کے ذکر کے بعد اس اصل بیماری کا پتہ بھی دے دیا جس سے یہ تمام بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

'اَلَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ'۔ یہ آخر میں اسلوب بدل کر، خاص اہتمام کے ساتھ، شرک کا ذکر فرمایا۔ 'شرک' تمام دین واخلاق کا ہادم اور تمام فساد فی الارض کی جڑ ہے۔ شرک کے ساتھ قیامت کو کوئی مانے بھی تو یہ ماننا بالکل بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے۔ اگر آدمی اس وہم میں مبتلا ہو کہ فلاں خدا کا شریک یا اس کا ایسا چہیتا ہے کہ وہ جو بات چاہے خدا سے منوا سکتا ہے تو پھر اس کے لیے قیامت کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوا۔ وہ اپنے زعم میں اس کو راضی رکھ کے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون بن سکتا ہے!

یہاں عربیت کے اس اسلوب پر بھی نظر رہے جس کا ذکر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آرہے ہیں کہ جب صفات کا ذکر حرفِ عطف کے بغیر ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ یہ تمام صفات موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔ ساتھ ہی یہ نکتہ بھی نگاہ میں رہے کہ یہاں صفات کے بیان میں ترتیب فروع سے اصول کی طرف ہے۔ ناشکری اور بخل سے آغاز کیا ہے، انکار قیامت اور شرک پر ختم کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آدمی اگر قیامت کے باب میں مشتبہ اور شرک میں مبتلا ہو تو اس کا کردار وہ بنتا ہے جو ان آیات میں بیان ہوا۔

'فَاَلْقِیٰہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ' یہ اسی اوپر والے 'اَلْقِیَا' کی تاکید ہے۔ اوپر فرمایا کہ اس کو جہنم میں جھونک دو۔ پھر اس کی صفات کا حوالہ دینے کے بعد مزید شدت و تاکید کے ساتھ فرمایا کہ اس کو جہنم کے 'عَذَابٍ شَدِیْدٍ' میں جھونک دو۔ 'جَہَنَّمَ' کے متعلق یہ وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ اس کے سات دروازے اور متعدد طبقات ہوں گے۔ مذکورہ صفات کردار کے لوگوں کے لیے اس کے عذاب شدید میں داخل کرنے کا حکم ہوگا۔

قَالَ قَرِیْنُہٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُہٗ وَلٰکِنْ کَانَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ۝ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ (۲۷-۲۸)

یہ جہنم کے بارے میں، داخل ہونے کے بعد کا ماجرا بیان ہو رہا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد ہر ایک اپنی گمراہی کا الزام اس شیطان پر تھوپنا چاہے گا جو سنتِ الٰہی کے مطابق ان لوگوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل رہتے ہیں۔ شیطان جب دیکھے گا کہ اس کو مجرم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو وہ آگے بڑھ کر اپنی صفائی پیش کرے گا کہ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ (اے ہمارے رب، میں نے اس کو طغیان میں نہیں مبتلا کیا بلکہ وہ خود ہی گمراہی میں اتنی دور نکل گیا تھا کہ وہاں سے اس کے لیے بازگشت کا امکان باقی نہیں رہا) شیطان کے قول مَآ اَطْغَيْتُهٗ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ گمراہی کی دعوت دینے سے انکار کرے گا۔ قرآن میں تصریح ہے کہ وہ یہ اعتراف کرے گا کہ اس نے گمراہی کی دعوت ضرور دی لیکن اس دعوت کو قبول کرنے والا یہ خود بنا۔ اس پر اس کو اس نے مجبور نہیں کیا۔ دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یوں ہوئی ہے۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ (ابراہیم: ۲۲)

اور جب معاملہ کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے سچی بات کہی تھی وہ اس نے پوری کر دی اور میں نے تم سے جھوٹے وعدے کیے تھے سو میں نے خلاف ورزی کی اور مجھ کو تمہارے اوپر کوئی اختیار تو حاصل تھا نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہی تو مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے ہی کو ملامت کرو۔ اب تو نہ میں تمہارا فریادرس بن سکتا اور نہ تم میرے فریادرس بن سکتے۔

وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ گمراہی میں اتنی دور نکل جا چکا تھا کہ اس کے لیے حق کی طرف بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جو لوگ نیکی کی راہ سے اپنے آپ کو بہت دور کر لیتے ہیں وہ بالآخر توفیقِ ہدایت سے محروم ہو کر شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ گویا شیطان نے اس بات کی دلیل بیان کی ہے کہ یہ شخص اگر اس کے ہتھے چڑھا تو اس وجہ سے کہ اپنی ضلالت پسندی کے سبب سے یہ سنتِ الٰہی کے مطابق اس کا مستحق بن چکا تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح شیطان قیامت کے روز اپنے پیروؤں سے اظہارِ براءت کرے گا اسی طرح وہ لیڈر بھی ان لوگوں کی گمراہی کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کریں گے جو ان کی پیروی میں گمراہ ہوئے ہوں گے۔ یہ بات قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہے۔ ہم سورۂ ابراہیم سے

ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝ (ابراھیم ۱۴: ۲۱)	اور سب کے سب اللہ کے آگے پیش ہوں گے تو کمزور لوگ ان لوگوں سے جو بڑے بنے رہے، کہیں گے کہ ہم تو آپ لوگوں کے پیرو بنے رہے تو کیا آپ لوگ اللہ کے عذاب میں سے بھی کچھ حصہ ٹالنے والے بنیں گے؟ وہ جواب دیں گے کہ اگر اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہوتی تو ہم تمھیں بھی صحیح راہ بتاتے۔ اب تو یکساں ہے، خواہ ہم روئیں پیٹیں یا صبر کریں، ہمارے لیے اب کوئی مفر نہیں!

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ: اس تو تکار پر اللہ تعالیٰ ان کو تنبیہ فرمائے گا کہ اب میرے سامنے تمھارا یہ جھگڑا بالکل بے سود ہے۔ یہ الزام بازی کسی کو بھی اس کی گمراہی کی ذمہ داری سے بری قرار دینے والی نہیں بن سکتی۔ میں نے اپنی وعید سے ہر ایک کو پہلے سے آگاہ کر دیا تھا اس وجہ سے حجت تمام ہو چکی ہے اور کسی کے لیے بھی کسی عذر کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

'وعید' سے اشارہ اس وعید کی طرف ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت آگاہ فرما دیا تھا جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا تھا کہ اگر تو نے مجھے مہلت دی تو میں اولادِ آدم کی اکثریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جا، جس کو تو گمراہ کر سکے، گمراہ کر لے۔ میں بھی آگاہ کرتا ہوں کہ جو بھی تیری پیروی کریں گے، خواہ جنات ہوں یا انسان، میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔

اس وعید کے بعد اللہ تعالیٰ نے برابر اپنے نبی اور رسول بھیجے جو وقفہ وقفہ کے ساتھ آ کر، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بھی آگاہ کرتے رہے اور شیطان اور اس کی ذریات کی پیروی کے انجام سے بھی جو گمراہی میں مبتلا ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد وہ جن نتائج سے دوچار ہوں گے ان میں انھوں نے جان بوجھ کر گویا خود چھلانگ لگائی ہے۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۲۹)

یہ اسی بات کی مزید وضاحت اور تاکید ہے۔ فرمایا کہ جس بات سے میں پہلے سے آگاہ کر چکا ہوں، اب تمھارے ایک دوسرے پر الزام دھرنے یا رونے دھونے سے وہ بدلی نہیں جا سکتی۔ اللہ کے وعدے اور اس کی وعیدیں بالکل قطعی اور اٹل ہیں۔ یہ جو کچھ تمھارے سامنے آ رہا ہے تمھارے اپنے ہی اعمال کا ثمرہ ہے اس وجہ سے اب اس کو بھگتو۔ میں اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم

کرنے والا نہیں ہوں۔

عربیت کے ایک اسلوب کی وضاحت

'وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ' میں عربیت کا جو اسلوب ہے اس کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہم کر چکے ہیں کہ جب مبالغہ پر نفی آتی ہے تو اس سے مقصود مبالغہ فی النفی ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ میں بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین عام طور پر اس اسلوب سے چونکہ ناواقف ہیں اس وجہ سے وہ اس کو 'لَيْسَ بِظَالِمٍ' کے معنی میں لیتے ہیں اور مترجمین اپنے ترجموں میں انہی کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ یہ الفاظ قرآن سے صریح بے پروائی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر مقصود یہی کہنا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں ہے تو زبان کا سادہ اسلوب چھوڑ کر اس مطلب کے ادا کرنے کے لیے 'لَيْسَ بِظَلَّامٍ' کا اسلوب کیوں اختیار کیا جاتا؟ قرآن میں ہر لفظ اور ہر اسلوب کا ایک خاص مقام ہے جس کو اچھی طرح سمجھے بغیر آیت کی صحیح تاویل ممکن نہیں ہے۔

کلامِ عرب میں اس اسلوب کی مثالیں موجود ہیں۔ شعرائے جاہلیت میں سے امراؤالقیس نے اپنے اشعار میں 'اَلْمَرْءُ لَيْسَ بِقَتَّالٍ' اور 'اَلْمَرْءُ لَيْسَ بِفَعَّالٍ' کی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اس کے حریف نے اس کو جنگ اور قتل کی دھمکی دی تھی تو اس نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ یہ مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے حالانکہ اس بزدل میں قتل و قتال کا ذرا بھی داعیہ نہیں ہے۔ 'لَيْسَ بِفَعَّالٍ' اس کے اندر کچھ بھی کر سکنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ بعض دوسرے شعراء نے بھی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نوع کی ترکیبیں استعمال کی ہیں لیکن افسوس ہے کہ دمِ تحریر میرے پاس دواوین نہیں ہیں۔ تاہم میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت پر مجھے پورا اطمینان ہے۔

قرآن میں یہی بات دوسرے اسلوب میں بھی فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۴۰) — اللہ ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

سورۂ یونس میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا (۴۴) — اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔

اگر کسی شخص کو یہ شبہ ہو کہ 'مبالغہ فی النفی' کا جو ضابطہ ہم نے بیان کیا ہے وہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے تو اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ہماری تاویل کی صحت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ یہ قاعدہ عربی میں، ایک جزئیے کی حیثیت ہی سے سہی، موجود ہے۔ جب یہ قاعدہ موجود ہے تو قرآن کی تاویل میں تمام ائمۂ فن کے نزدیک یہ اصول مسلّم ہے کہ کسی آیت میں دو تاویلوں کا امکان ہو تو اس تاویل کو ترجیح دی جائے گی جو احسن اور نظائرِ قرآن کے مطابق ہو۔ یہاں ہماری تاویل کے حق میں کئی باتیں موجود ہیں۔

— یہ عربیت کے اسلوب کے مطابق ہے۔

— یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے شایانِ شان ہے اس لیے کہ وہ بہر حال ہر شائبۂ ظلم سے پاک ہے۔ وہ نہ نیکوں پر کوئی ظلم کرے گا نہ بدوں پر۔

— قرآن کے نظائر و شواہد سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

ہمارے مفسرین میں سے صرف صاحب کشاف نے اس آیت کے اشکال سے تعرض کیا ہے، لیکن انھوں نے جس طرح اس کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اس سے ان کے مسلکِ اعتزال کی تائید تو نکل آتی ہے لیکن ساتھ ہی بعض دوسرے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے انھوں نے تعرض نہیں کیا۔

ان کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنے اطاعت گزار بندوں پر ظلم کرے تو یہ بڑا ظلم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا ظالم نہیں ہے۔

صاحبِ کشاف کی اس تاویل پر یوں تو بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں لیکن ہم بخیالِ اختصار صرف دو باتوں کا ذکر کریں گے۔

ایک یہ کہ آیت میں اطاعت گزاروں یا نافرمانوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ 'عَبِيد' (بندوں) کا لفظ ہے جو تمام بندوں کو عام ہے، خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ ہر ایک سے متعلق یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ تحدید و تخصیص بالکل بے دلیل بلکہ قرآن کے الفاظ کے خلاف ہے۔

دوسری یہ کہ آیت کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات فرمائی ہی ہے ان لوگوں کو مخاطب کر کے جو جہنم کے مستحق تھے۔ ان کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ تمھارے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جس کے تم سزاوار تھے۔ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

کشاف کی اسی تاویل کو اس دور کے بعض لوگوں نے اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خالق ہے، وہ خالق ہو کر اگر اپنی مخلوق پر ظلم کرے تو یہ بہت بڑا ظلم ہو جائے گا درآنحالیکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی شان کے منافی ہے کہ وہ بہت بڑا ظالم بن جائے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے ظلّام ہونے کی نفی فرمائی۔

یہ بات کہنے والوں کو شاید علم نہیں ہے کہ ہمارے متکلمین کے سوادِ اعظم نے تو اسی دلیل کی بنا پر کہ خدا خالق ہے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ خدا کے کسی فعل پر ظلم و جور کا حکم لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ اگر نیکوں کو جہنم میں ڈال دے تو یہ بھی عدل ہے اور اگر نافرمانوں کو جنت بخش دے تو یہ بھی عدل ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ پرانے متکلمین کی یہ بات غلط ہونے کے

باوجود اتنی غلط نہیں ہے جتنی غلط اس دور کے نئے متکلمین کی بات ہے۔

دوسرے ان حضرات نے اس پہلو پر بھی غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے ظلم و جور کی جو نفی کی ہے تو اپنی صفاتِ عدل، رحمت اور حکمت کی بنا پر کی ہے۔ اس بنیاد پر کہیں اس کی نفی نہیں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس وجہ سے وہ بڑا ظالم نہیں بن سکتا۔

مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ان حضرات کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا، وہ یہ کہ اگر یہ فلسفہ صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ غیر خالق کی طرف سے مخلوقاتِ الٰہی پر ظلم ہو تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا ظلم ہو لیکن وہ ظلّام نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ فرعون و ہامان اور نمرود و شدّاد بھی ان کے نزدیک بڑے ظالم نہیں ہوں گے اس لیے کہ وہ خالق نہیں تھے اور بڑا ظلم صرف وہی ہوتا ہے جو خالق سے صادر ہو۔ معلوم نہیں یہ علم کلام ان حضرات نے کس مکتب میں پڑھا ہے کہ جو خالق و رازق ہے وہ اگر ظلم کرے تو وہ ظلّام ہو جائے اور جو نہ خالق ہیں نہ رازق وہ اگر ظلم ڈھائیں تو صرف ظالم رہیں۔

بہر حال یہ ساری موشگافیاں، خواہ قدیم متکلمین و مفسرین کی ہوں یا نئے مترجموں و مفسروں کی، عربی زبان کے اس اسلوب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہیں جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے۔

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ (۳۰)

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی

فرمایا کہ اس دن کو اچھی طرح یاد رکھو جس دن ہم دوزخ سے سوال کریں گے کہ تو اچھی طرح بھر گئی یا نہیں! وہ جواب دے گی ابھی اور بھی ہیں! یہ سوال و جواب صورتِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتا ہے اور بیانِ واقعہ بھی۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بنائی ہیں وہ سب اس کے سوالوں کو سمجھتی بھی ہیں اور ان کے جواب بھی دیتی ہیں۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے صامت چیزوں کو بھی ناطق بنا دے۔ قرآن میں ہے کہ جب مجرموں کے اعضاء و جوارح ان کے خلاف گواہی دیں گے تو وہ حیران ہو کر ان سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ جواب دیں گے کہ أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰم السجدۃ: ۲۱) ہمیں اسی خدا نے ناطق بنا دیا جس نے ہر چیز کو ناطق بنایا ہے۔

یہ سوال و جواب اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اور اس کے بے پایاں غضب کی تصویر ہے کہ دوزخیوں کو دوزخ میں بھرتے ہوئے ذرا بھی اس کو تردد لاحق نہیں ہوگا بلکہ وہ پوری بے نیازی سے سب کو جہنم میں پھنکوا دے گا اور پھر جہنم سے پوچھے گا کہ کیوں تیرا پیٹ اچھی طرح بھر گیا یا نہیں؟ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اتنی بے شمار خلقت کو جہنم میں جھونکنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو کچھ تاسف ہوگا کہ اپنی پیدا کی ہوئی اتنی مخلوق کو میں نے آگ میں جھونک دیا بلکہ اس کے جوشِ غضب کا یہ حال ہوگا کہ اور بھی ہوں تو ان کو بھی وہ جہنم کا ایندھن بنا دے۔

'وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ'۔ جہنم کے اس جواب کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ جس جوشِ غضب کے ساتھ یہ سوال فرمائے گا اسی جوش کے ساتھ وہ بھی جواب دے گی کہ اور بھی ہوں تو میرے اندر بڑی سمائی ہے، ان کو بھی لائیے۔ دوسرا یہ کہ دوزخیوں کی اس کثرت کو دیکھ کر اس کا حوصلہ جواب دے جائے گا اور وہ بے حوصلہ ہو کر جواب دے گی کہ کیا اور بھی ہیں! اگرچہ آیت کے الفاظ سے یہ دونوں مفہوم نکل سکتے ہیں لیکن میں پہلے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مفہوم لینے میں دوزخیوں پر اللہ تعالیٰ کے جوشِ غضب اور جہنم کے جوشِ غضب میں پوری مطابقت ہو جاتی ہے اور یہی بات دوزخ کے لیے موزوں ہے کہ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل پورے جوش و ولولہ کے ساتھ کرے۔ دوسری یہ کہ قرآن میں جگہ جگہ دوزخ کی وسعت کا بیان اس انداز سے ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کو تنبیہ کیا جا رہا ہے جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بھلا اتنی مخلوق کو بھرنے کے لیے اتنی وسیع دوزخ کہاں سے لائی جائے گی۔ آیت 'لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ..... الاٰية' (الحجر: ۴۴) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے[1]۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض مقامات میں دوزخ کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے کہ جب دوزخی اس میں جھونکے جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ جوشِ غضب سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ 'اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ' (الملک: ۷-۸) یہی مضمون سورۂ ہود کی آیت ۱۰۶ میں بھی ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۳۱)

متقیوں کی عزت افزائی

دوزخیوں کے بعد اب یہ متقیوں کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ ان کی تشریف و تکریم اس طرح ہوگی کہ جنت، ایک پیشکش کی طرح، ان کے قریب لائی جائے گی، اس تک پہنچنے کے لیے انھیں کوئی زحمتِ سفر نہیں اٹھانا پڑے گی درآنحالیکہ وہ کچھ دور نہیں ہوگی۔ 'غَيْرَ بَعِيْدٍ' میرے نزدیک 'جنت' سے حال واقع ہے۔ اس حال کے لانے سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ 'قریب لانے' کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ وہ بہت دور سے قریب لائی جائے گی جس میں کچھ وقفہ صرف ہوگا، بلکہ وہ بالکل قریب ہی ہوگی لیکن اہلِ جنت کی عزت افزائی کے لیے مزید قریب لائی جائے گی۔ لفظ 'بعید' اگرچہ مذکر ہے لیکن اس کا مؤنث سے حال پڑنا عربیت کے خلاف نہیں ہے۔ زمخشری ؒ نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور مجھے اس کی رائے سے اتفاق ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ (۳۲)

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحات: ۶۰۶ - ۶۰۷

یعنی جنت کو قریب لاکر ان الفاظ کے ساتھ اہلِ جنت کو اس میں داخل ہونے کا پروانہ دیا جائے گا کہ یہ ہے وہ صلہ جس کا آپ لوگوں سے دنیا میں نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔ اب اس وعدے کا ایفاء ہو رہا ہے۔ مضارع سے پہلے عربیت کے قاعدے کے مطابق فعل ناقص محذوف ہے، یعنی مَا کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ ھٰذَا سے اشارہ اسی جنت کی طرف ہے لیکن یہاں عربیت کے قاعدہ کے مطابق اس سے علی سبیل التاویل صلہ اور انعام مراد ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

لِکُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍ: یہ اہلِ جنت کے اس کردار کا بیان ہے جس کی بنا پر وہ جنت کے حق دار ٹھہرائے گئے۔ اوپر اہلِ دوزخ کا کردار آیات ۲۵-۲۷ میں بیان ہو چکا ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اب یہ اس کے مقابل میں مستحقینِ جنت کا کردار بیان ہو رہا ہے کہ یہ اپنے رب کی طرف برابر رجوع رکھنے والے، اس کے حدود و قیود کی حفاظت کرنے والے تھے۔ ان دونوں صفتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ایک کا تعلق دل سے ہے اور دوسری کا تعلق عمل سے۔ اگر آدمی کا دل زندہ و بیدار ہو تو زندگی کے تمام ہنگاموں کے اندر اس کا دل برابر اپنے رب کی طرف رجوع رہتا ہے۔ کسی وقت بھی اس پر ایسی غفلت یا سرکشی کی حالت طاری نہیں ہوتی کہ اسے خدا کے حدود و محارم کا بھی کچھ ہوش نہ رہے اور وہ ان کو توڑ تاڑ کے رکھ دے۔ نفس کی کسی اکساہٹ کے باعث اگر اس سے کبھی تجاوز صادر ہو جاتا ہے تو اس کا دل فوراً متنبہ ہوتا ہے اور وہ توبہ و استغفار کے ذریعے سے پھر اپنے رویّہ کی اصلاح کر لیتا ہے۔ ان دو لفظوں کے اندر ایک صحیح مومن کا باطن و ظاہر دونوں بیان ہو گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ایک باخدا مومن ہونے کے لیے ترکِ دنیا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی امتحان یہ ہے کہ وہ اس کارزارِ حیات میں رہتے ہوئے اپنے اوّاب و حفیظ ہونے کو ثابت کرے۔ یہ امر بھی یاد رکھیے کہ اسلام میں ہر شخص کے لیے شب و روز میں پانچ مرتبہ مسجد کی حاضری اسی اوابیّت کو زندہ رکھنے کے لیے ہے۔ اس طرح گویا مومن اپنے مرکزِ ثقل سے وابستہ رہتا ہے اور شیطان اس پر کبھی اتنا قابو نہیں پاتا کہ اس کو فواحش و منکرات میں مبتلا کر دے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت: ۴۵)۔

مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ (۳۳)

اوپر مستحقینِ دوزخ کے بارے میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے کہ وہ دربابِ قیامت مبتلائے شک رہے اور اللہ کے مقابل میں انھوں نے دوسرے سہارے بنا لیے۔ وہاں ہم نے بیان کیا ہے کہ یہی دونوں چیزیں درحقیقت ام الامراض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہاں اس کے مقابل میں اہلِ جنت کے باب میں فرمایا کہ یہ اس قسم کے کسی وہم میں نہیں مبتلا ہوئے بلکہ غیب میں رہتے، خدائے رحمان سے

ڈرتے رہے اور چونکہ انھوں نے خدا کے سوا کوئی اور سہارا تلاش نہیں کیا اس وجہ سے اپنے رب کے حضور میں ایک ایسے دل کے ساتھ حاضر ہوئے جس کی ساری توجہ اپنے رب ہی کی طرف رہی اس لیے کہ ان کی ساری امیدیں اسی سے وابستہ تھیں، کسی اور سے انھوں نے لو نہیں لگائی۔

دین کی ایک عظیم حکمت

'مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ' میں خدا کی صفت 'رحمٰن' کا حوالہ دین کی ایک عظیم حکمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ بالآخر ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں کو جزا دے جنھوں نے اس دنیا میں ایک 'اوّاب' اور 'حفیظ' کی زندگی گزاری اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے 'کفّار' اور 'عنید' بن کر اس میں دھاندلی مچائی۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ نیکی اور بدی، ظلم اور عدل دونوں اس کی نگاہوں میں یکساں ہیں۔ درآنحالیکہ یہ بات اس کی رحمانیت و رحیمیت کے بالکل منافی ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا یہ لازمی تقاضا بیان فرمایا ہے کہ وہ قیامت کا دن ضرور لائے گا۔ 'كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ' (الانعام: ۱۲) (اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے کہ وہ تم کو ضرور قیامت کے دن کے لیے جمع کر کے رہے گا) اہلِ ایمان چونکہ اپنے رب کی اس صفت اور اس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے رہے اس وجہ سے انھوں نے قیامت کو اٹل حقیقت سمجھا اور اس کے لیے برابر بیدار رہے۔

'بِالْغَيْبِ' میں 'ب' ظرفیہ ہے۔ منکرینِ قیامت کے باب میں تو اوپر ارشاد ہوا کہ قیامت کے دن ان کے سامنے جب حقائق آشکارا ہوں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ 'لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ' (ق: ۲۲) (تم اس دن سے غفلت میں رہے تو ہم نے تمھاری نگاہوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تو تمھاری نگاہیں بہت تیز ہیں) اس کے برعکس ان اہلِ ایمان کا حال یہ رہا کہ اسی دنیا میں رہتے اور آخرت کے حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کیے بغیر، مجرد آفاق و انفس کے دلائل اور نبیوں کی تعلیم کی بنا پر وہ آخرت کو مانتے اور اپنے رب سے ڈرتے رہے۔

'قلب منیب' سے مراد وہ دل ہے جو رنج و راحت اور امید و بیم ہر حال میں اپنے رب ہی کی طرف متوجہ رہا۔ کسی حال میں بھی اپنے رب سے منہ موڑ کر کسی اور سے اس نے لو نہیں لگائی۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (۳۴)

ابدی بادشاہی

یعنی ان سے کہا جائے گا کہ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اب نہ اس میں تمھارے لیے ماضی کا کوئی پچھتاوا ہوگا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ابدی بادشاہی کا جو وعدہ تم سے کیا گیا تھا اس کے دیے جانے کا وقت آ گیا۔ یہ بادشاہی تم سے کبھی چھینی نہیں جائے گی اور نہ کبھی [illegible]

میں کوئی رخنہ پیدا ہوگا۔ سورہ حجر کی آیت ۴۶ میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے: اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ (اس میں داخل ہو جاؤ، کامل سلامتی کے ساتھ، ہر اندیشہ سے محفوظ ہو کر) قرآن میں اس بات کا ذکر بھی جگہ جگہ آیا ہے کہ فرشتے سلام کے ساتھ اہل جنت کا خیر مقدم کریں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سلام و پیام کا ذکر بھی آیا ہے، لیکن ان کا محل اور ہے۔ یہاں مدعا وہی ہے جس کی تائید سورۂ حجر کی آیت سے ہو رہی ہے۔

لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ (۳۵)

اس میں ان کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس مزید بھی ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جو وہ چاہیں گے وہ تو ان کو ملے گا ہی لیکن ہمارے پاس ایسی نعمتیں بھی ہوں گی جن کا ان کو کوئی تصور بھی نہیں ہوگا کہ وہ ان کے ارمان کر سکیں لیکن ہم ان کے چاہے بغیر ہی وہ نعمتیں بھی ان کو دیں گے۔ اسی حقیقت کی طرف دوسرے الفاظ میں یوں بھی اشارہ فرمایا گیا ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (السجدۃ ۳۲: ۱۷) (پس کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کے لیے آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے)۔

۴۔ آگے آیات ۳۶ - ۴۵ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ پہلے قریش کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اپنی موجودہ قوت و صولت کے غرے میں خدا سے لڑنے کی جسارت نہ کرو۔ تم سے پہلے کتنی ہی قومیں گزر چکی ہیں جو قوت و صولت میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوئی ہیں لیکن جب خدا نے ان کو پکڑا تو وہ اپنے کو بچا نہ سکیں۔ اگر تمھارے پاس سمجھنے والے دل اور سننے والے کان ہیں تو ان کی سرگزشتوں میں تمھارے لیے بڑا درس عبرت ہے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ مخالفین جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کرو۔ قیامت شدنی ہے۔ ہم آسمان و زمین کو پیدا کر کے تھک نہیں گئے کہ مرنے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ نہ کر سکیں گے۔ پس کان لگائے ہی رکھو۔ وہ دن آہی رہا ہے جب خدا کا منادی پکارے گا اور سب قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ پس صبر کرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ تمھاری ذمہ داری لوگوں کو مومن بنا دینا نہیں ہے بلکہ صرف اس قرآن کے ذریعہ سے ان لوگوں کو ہماری وعید سے آگاہ کر دینا ہے جو آگاہ ہونا چاہیں ـــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا

آیات ۳۶ - ۴۵

فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ۭ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ڰ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿٣٨﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿٣٩﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿٤٠﴾ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿٤٢﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿٤٤﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾

ع ٣ ١٦/١٧

ترجمہ آیات ٣٦-٤٥

اور کتنی ہی قومیں ہم نے ہلاک کر چھوڑیں ان سے پہلے جو قوت میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں تو جس کا جدھر سینگ سمایا ادھر کو، ملکوں میں، چل کھڑا ہوا کہ ہے کوئی پناہ کی جگہ! بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی یاددہانی ہے جن کے پاس دل ہو یا وہ بات سننے کے لیے کان لگائیں، متوجہ ہو کر۔ ٣٦-٣٧

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو، چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی۔ تو جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرتے رہو، اس کی حمد کے ساتھ، سورج کے

طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور رات میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے ڈھلنے کے بعد بھی۔ ۳۸-۴۰

اور کان لگائے رکھو جس دن منادی بہت قریب کی جگہ سے پکارے گا۔ جس دن یہ سنیں گے چیخ کو شدنی کے ساتھ۔ وہ دن نکل کھڑے ہونے کا ہوگا۔ بے شک ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹنا ہوگا۔ اس دن زمین ان کے اوپر سے کھل جائے گی اور وہ تیزی سے نکلتے ہوں گے۔ یہ اکٹھا کر لینا ہمارے لیے نہایت آسان ہے۔ ۴۱-۴۴

ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اور تم ان پر کوئی داروغہ مقرر نہیں ہو۔ پس اس قرآن کے ذریعے سے ان لوگوں کو یاددہانی کردو جو میری وعید سے ڈرتے ہوں۔ ۴۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ۭ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ (۳۶)

قریش کو تنبیہ

یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ وہ اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ ان کو بڑی قوت و شوکت حاصل ہے، اپنی جگہ سے ہلائے نہیں جا سکتے۔ ان سے پہلے کتنی ہی قومیں گزری ہیں جو قوت و عظمت میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ ان میں سے اگر کچھ ہلاک ہونے سے بچ بھی رہے تو وہ مختلف ملکوں میں، جدھر جس کا سینگ سمایا، وہ ادھر کو کسی جائے پناہ کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے۔

'نَقَّبَ فِي الْاَرْضِ' کے معنی ہیں 'سَارَ فِيْهَا طَلَبًا لِلْمَهْرَبِ' (اور وہ زمین میں کسی جائے پناہ کی تلاش میں چل کھڑا ہوا) 'هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ' ان کے چل کھڑے ہونے کے محرک کا بیان ہے کہ سر چھپانے کی جگہ کی تلاش میں جدھر کو جس کا منہ اٹھا وہ ادھر ہی کو چل کھڑا ہوا۔

جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو اس کا حال یہی ہوتا ہے۔ قوم کے کارفرما عناصر، جو سارے فساد کے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہ تو تباہ ہو جاتے ہیں، عوام میں سے جو بچ رہتے ہیں وہ قومی جمعیت کے پارہ پارہ ہو جانے کے بعد پراگندہ ہو کر جس کو جہاں پناہ ملنے کی توقع ہوتی ہے وہ اسی طرف کا رخ کر لیتا ہے۔

قوموں کی تباہی کی مختلف صورتیں

قرآن میں جن قوموں کے حالات بیان ہوئے ہیں ان میں سے بعض تو معلوم ہوتا ہے کہ لوری کی پوری عذابِ الٰہی سے تباہ ہو گئیں، مثلاً قومِ نوح، عاد اور ثمود وغیرہ۔ بعض قوموں کا حال یہ ہوا کہ ان کے مترفین و متکبرین تو تباہ ہو گئے اور ان کے اتباع و عوام تو وہ ادھر ادھر پراگندہ ہو گئے۔ فرعون اور اس کی قوم کی تباہی کی صورت یہی ہوئی۔ وہ خود تو اپنے اعیان اور پوری فوج سمیت، دریا میں غرق کر دیا گیا۔ باقی جو پیچھے رہ گئے تھے وہ حکومت کی تباہی اور اپنے حریفوں کے ڈر سے پناہ کی تلاش میں تتر بتر ہو گئے۔

اسی سے ملتے جلتے حالات، ملکِ سبا میں پیش آئے۔ بے شمار افراد تو اس سیلاب ہی کی نذر ہو گئے جو ان پر آیا۔ جو بچ رہے وہ علاقہ کے بنجر اور معاشی حالت بالکل ابتر ہو جانے کے باعث مجبور ہوئے کہ پناہ کی تلاش میں دوسرے علاقوں کا رخ کریں۔ یہود پر جو تباہیاں آئیں ان کی نوعیت بھی یہی تھی۔ جو قتل و نہب سے بچے وہ دنیا کے کونے کونے میں آوارہ ہو کر پھرے۔ خود ہماری تاریخ میں بھی اس کی نہایت عبرت انگیز مثالیں موجود ہیں۔ بغداد پر، قرطبہ پر، دلی پر جو تباہیاں آئیں کیا ان کے احوال تاریخ میں مذکور نہیں ہیں؟ ان کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں صرف قریش ہی کو تنبیہ نہیں ہے بلکہ خود ہمارے لیے بھی اس میں بڑا درس ہے بشرطیکہ ہم اس سے سبق حاصل کریں!

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے 'نَقَّبُوْا فِی الْبِلَادِ' کے یہ معنی لیے ہیں کہ انھوں نے اپنے دورِ عروج میں اپنی فاتحانہ ترک تازیوں سے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ لفظ 'تنقیب' عربی میں فاتحانہ جولانیوں کے لیے نہیں آتا بلکہ ڈر اور خوف سے، جائے پناہ کی تلاش میں، زمین میں نقب لگانے کے لیے آتا ہے۔ اہلِ لغت نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اور ہم اس کا حوالہ دے چکے ہیں۔ کلامِ عرب کے شواہد سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے اور بعد کا ٹکڑا 'هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ' نہایت واضح طور پر اسی معنی کے حق میں ہے۔ ورنہ یہ جملہ بالکل بے محل ہو کر رہ جائے گا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ (۳۷)

قریش کو تنبیہ اور آنحضرت کو تسلی

'ذٰلِکَ' کا اشارہ انہی قوموں کی سرگزشت کی طرف ہے جن کا بالاجمال اوپر کی آیت میں حوالہ دیا گیا ہے۔ فرمایا کہ ان قوموں کی سرگزشت میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے بشرطیکہ عبرت حاصل

کرنے والے دل اور بات کو توجہ کے ساتھ سننے والے کان ہوں۔

لفظ 'قلب' اپنے حقیقی یعنی دلِ زندہ کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب کو احساس کرنے، عبرت حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کے لیے بنایا ہے۔ جب تک آدمی کا دل یہ کام کرتا ہے اس وقت تک اس کا دل زندہ ہے اور جب تک دل زندہ ہے اس وقت تک آدمی بھی زندہ ہے۔ اس لیے کہ آدمی کی حقیقی زندگی اس کے دل کی زندگی ہی سے ہے۔ اگر دل یہ خصوصیات کھو بیٹھا تو پھر آدمی بھی مردہ ہے اگرچہ اس کی رگوں میں کتنا ہی خون دوڑتا پھرتا ہو۔

اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ۔ یعنی اگر دل پوری طرح بیدار نہ ہو تو کم از کم اتنی بات تو انسان کے اندر ہو کہ کوئی معقول آدمی اس کو کوئی بات سنائے تو وہ اس کو توجہ سے سنے۔ یہ توجہ بھی انسان کے لیے بڑی خیر و برکت کا باعث ہے۔ اس سے بھی بسا اوقات دل کی غفلت دور اور اس کی عبرت پذیری کی صلاحیت زندہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جو شخص ایسا بدقسمت ہو کہ نہ اس کا دل ہی بیدار ہو اور نہ وہ کسی معقول آدمی کی بات سننے ہی کے لیے اپنے کان کھولنے پر آمادہ ہو تو ایسے آدمی کے اندر کوئی معقول بات کدھر سے راہ پائے گی؟

اگرچہ سیاقِ کلام یہاں قریش کو تنبیہ و ملامت کا ہے لیکن اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی بھی ہے کہ تم جو قرآن سنا رہے ہو اگر قریش کے لیڈروں کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نہ تو ان کے دلوں کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت ہی ہے اور نہ یہ کان کھول کر تمہاری بات توجہ سے سننے ہی کے لیے تیار ہیں تو آخر تم اپنی بات کس طرح ان کے دلوں میں اتار سکتے ہو؟

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ o فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ o وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْہُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۳۸-۴۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین

اب کلام کا رخ واضح طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی اور تلقینِ صبر کے مضمون کی طرف مڑ گیا ہے۔ اس کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ ہم آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں تھک نہیں گئے ہیں کہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز رہ جائیں گے۔ اطمینان رکھو کہ جس دن سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ آ کے رہے گا۔ ان کی باتوں پر صبر کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کا اہتمام رکھو۔

'فی ستۃ ایام' کا مطلب

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ۔ آسمان و زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'اَیَّام' سے

یہاں مراد خدائی ایام ہیں اور اسی وجہ سے یہ ادوار کے مفہوم میں ہیں۔ یہ بات بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کی خلقت کا ذکر چھ دنوں کی قید کے ساتھ ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس اہتمام کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے جو اس کائنات کی تخلیق میں ملحوظ ہے اور جو اس بات پر دلیل ہے کہ یہ دنیا نہ تو کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آئی ہے نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا ہے بلکہ یہ ایک بامقصد کارخانہ ہے اور اس کے بامقصد ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں اس کی غایت واضح ہو۔

'وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ' یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو کہ چھ دن مسلسل کام کرنے کی وجہ سے ہم کو تکان لاحق ہو گئی ہے اور اب دوبارہ اس دنیا کو پیدا کرنے کا حوصلہ ہم نہ کر سکیں گے۔ ہم جس طرح پہلے تازہ دم تھے اسی طرح اب بھی تازہ دم ہیں اور جس طرح پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز نہیں رہے اسی طرح دوبارہ پیدا کرنے سے بھی عاجز نہیں رہیں گے۔ اس فقرے کا انداز کچھ طنزیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا کی از سرِ نو خلقت کو بعید از امکان سمجھ رہے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ ہمارا دم خم اسی طرح قائم ہے جس طرح پہلے تھا۔ اس میں سرِ مو فرق نہیں آیا ہے۔ اس میں ضمناً یہود کے اس خیال پر بھی تعریض ہے جو تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔

'فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ' یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر ہے کہ یہ جو کچھ تمہاری تکذیب میں کر رہے ہیں اس پر صبر کرو۔ 'مَا یَقُوْلُوْنَ' سے اشارہ مکذبین کی اسی طرح کی باتوں کی طرف ہے جس کی ایک مثال آیات ۲-۳ میں گزر چکی ہے۔ 'فَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا ذٰلِکَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ' (۲-۳) (تو کافروں نے کہا یہ تو نہایت عجیب بات ہے! کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو ہم از سرِ نو اٹھائے جائیں گے! یہ لوٹایا جانا تو نہایت مستبعد ہے!!) مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا جو اللہ نے اس اہتمام سے پیدا کی ہے وہ لازماً اپنی غایت کو پہنچ کر رہے گی۔ ہم اس کو پیدا کر کے تھک نہیں گئے ہیں کہ اس کو دوبارہ نہ پیدا کر سکیں لیکن جو لوگ دل کے اندھے ہیں وہ اس حقیقت کو اسی وقت تسلیم کریں گے جب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اس طرح کے لوگوں کی مخالفت پر تمہیں بہر حال صبر کرنا ہے تو صبر کرو تاآنکہ ان کے سامنے حقیقت اس طرح ظاہر ہو جائے کہ انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

حصولِ صبر کی تدبیر

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ' یہ صبر حاصل کرنے کی تدبیر بتائی ہے کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز کا اہتمام رکھو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گہرے تعلق کے بغیر وہ صبر پیدا نہیں ہو سکتا جو مخالفوں کی مخالفت کے علی الرغم آدمی کے قدم جادۂ حق پر استوار

رکھ سکے۔ اسی حقیقت کی طرف دوسری جگہ یوں اشارہ فرمایا ہے کہ 'وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ' (النحل: ۱۲۷) (اور تم صبر نہیں کر سکتے مگر اللہ کی استعانت سے)۔ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا واحد ذریعہ چونکہ نماز ہے اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفوں کے مقابل میں جہاں جہاں صبر کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہاں نماز کے اہتمام کی تاکید ضرور فرمائی گئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی جگہ جگہ گزر چکی ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی نہایت واضح اور مؤثر مثالیں آئیں گی۔

'سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ'۔ یہ نماز کی تعبیر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے پہلو سے ہے۔ یہ ذکر دو عنصروں سے مرکب ہے۔ ایک 'تسبیح' دوسرا 'حمد'۔ تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان باتوں سے پاک و منزّہ قرار دینا جو اس کی شان کے منافی ہیں۔ 'حمد' میں اثبات کا پہلو نمایاں ہے یعنی اس کو ان صفات سے متصف قرار دینا جو اس کے شایانِ شان ہیں۔ یہ نفی اور یہ اثبات دونوں مل کر اللہ تعالیٰ کے صحیح تصور کو دل میں راسخ کرتے ہیں اور اسی رسوخ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا صحیح تعلق قائم ہوتا ہے جو تمام صبر و توکل کی بنیاد ہے۔ اگر ان کے اندر کسی پہلو سے کوئی ضعف یا عدم توازن پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے متعلق آدمی کا تصوّر غلط ہو جاتا ہے اور یہ غلطی اس کے سارے نظامِ فکر و عمل کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔

اوقاتِ نماز اور ان کی حکمت

'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ'۔ یہ ان خاص خاص اوقات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح خاص اہتمام سے مطلوب ہے۔ یوں تو اللہ کی یاد ہر وقت زندگی بخش ہے، اس کی یاد ہی سے دل زندہ اور راضی و مطمئن رہتا ہے لیکن اس دنیا کے دوسرے کاموں میں جس طرح اوقات اور فصلوں و موسموں کا اعتبار ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادات میں بھی اوقات و ساعات کا لحاظ ہے۔ نمازوں کے لیے جو اوقات خاص کیے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں کے اندر جو اوقات اس کائنات میں کسی بڑے تغیر کی علامت ہیں، جو عالم کے متصرفِ حقیقی کی عظمت و قدرت کی یاد دہانی کرنے والے ہیں اور جن میں اس کائنات کی دوسری نمایاں چیزیں بھی اپنے خالق کے آگے سرفگندہ ہوتی ہیں، وہی اوقات ہماری نمازوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں اور خاص الخاص وقت فجر کا ہے۔ جب رات اپنی بساط لپیٹتی ہے، ستارے اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور نئے دن کی سحر طلوع ہوتی ہے؛ اور پھر اس کے ٹھیک مقابل میں عصر کا وقت ہے جب دن کی سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوتی ہیں اور سورج اپنے رب کے آگے سربسجود ہو جانے کے لیے اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ چنانچہ آیت میں پہلے انہی دونوں وقتوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ 'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ' سے

فجر کا وقت مراد ہے اور 'قَبْلَ الْغُرُوْبِ' سے عصر کی طرف اشارہ ہے۔ ان دونوں نمازوں کی ہمارے دین میں جو اہمیت ہے وہ قرآن اور حدیث دونوں میں واضح فرمائی گئی ہے۔

شب کی نمازیں

'وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ' دن کی دو اہم نمازوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی طرح شب میں بھی اپنے رب کی تسبیح کرو۔ شب میں دو نمازیں ہیں۔ شب کے پہلے حصہ میں عشاء اور آخری حصہ میں تہجد۔ تہجد اگرچہ فرائض میں داخل نہیں ہے لیکن تربیتِ صبر کے پہلو سے سب سے زیادہ اہمیت اسی نماز کو حاصل ہے۔ اس کی وضاحت مختلف مقامات میں ہو چکی ہے اور سورۂ مزمّل کی تفسیر میں، ان شاء اللہ، اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

'ادبار السجود' کا صحیح مطلب

'وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ'۔ 'ادبار' جمع ہے 'دبر' کی، جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ 'سجدوں کے بعد بھی اس کی تسبیح کرو'۔ لیکن میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں سجود مصدری معنی میں ہے اور اس سے مراد آفتاب کا سجود ہے جس کے طلوع و غروب کے قبل کی نمازوں کا ذکر اوپر والے ٹکڑے میں ہو چکا ہے۔ یعنی جس طرح سورج کے طلوع و غروب سے پہلے نماز کے اوقات ہیں اسی طرح سورج کے سجود کے بعد بھی تسبیح کے اوقات ہیں۔ چونکہ سورج کا ذکر پہلے ہو چکا تھا اس وجہ سے دوبارہ اس کی تصریح کی ضرورت نہیں ہوئی۔ لفظ 'اَدْبَارَ' کا قرینہ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کافی تھا کہ یہاں اسی کے سجود کے بعد کی نماز کا ذکر ہے جس کے طلوع و غروب سے پہلے کی نمازوں کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ اگر دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں 'وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ' کے الفاظ نہ آ گئے ہوتے تو بات کے سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آتی۔ اس صورت میں تالیف کلام یوں ہوتی کہ 'سورج کے طلوع اور اس کے غروب سے پہلے اور اس کے سجود کے بعد کے اوقات میں تسبیح کرو'۔ اس تالیف میں ہر شخص کا ذہن آسانی سے اس طرف منتقل ہو جاتا کہ 'سجود' سے مراد سجودِ شمس ہے لیکن تالیفِ کلام یوں ہوتی تو اس سے حکمتِ دین کا ایک اہم نکتہ واضح نہ ہو سکتا جو اس آیت میں واضح فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں نمازوں کی ترتیب دین میں ان کی اہمیت و عظمت کے اعتبار سے بیان ہوئی ہے۔ یہ ترتیب مقتضی ہوئی کہ سب سے پہلے فجر کا ذکر آئے، اس کے بعد عصر کا، چنانچہ 'قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ' کے الفاظ سے ان دونوں کا ذکر ہوا۔ اور ہم ذکر کر آئے ہیں کہ قرآن و حدیث دونوں میں ان نمازوں کی اہمیت پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اس کے بعد 'وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ' سے عشاء اور تہجد کی نمازوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو شب کی نمازوں میں وہی اہمیت رکھتی ہیں جو دن کی نمازوں میں فجر اور عصر کی نمازوں کو حاصل ہے۔ اس کے بعد 'اَدْبَارَ السُّجُوْدِ' کے الفاظ سے ظہر اور مغرب کی نمازوں کی طرف اشارہ ہے جو دلوکِ شمس اور سجودِ شمس کے اوقات سے تعلق رکھتی ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۸ 'اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ' کے تحت ہم سورج کے 'دلوک' کے مختلف مراحل کی وضاحت کر چکے ہیں [1] یہاں لفظ 'سجود' ہے اور اس کے بھی مختلف درجے ہیں۔ سورج اور دوسرے کواکب کے لیے جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے ان کے زوال اور غروب کے تمام مراحل مراد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہ سارے ہی مراحل مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی جب وہ سمت راس سے جھکتا ہے، جب وہ مرأی العین سے نیچے آتا ہے، پھر جب وہ افق سے غائب ہوتا ہے ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں انہی تین اوقات میں ہیں۔ یہاں عصر کی نماز کا ذکر، اس حکمت کے تحت جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، خاص اہتمام کے ساتھ اوپر 'قَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ' کے الفاظ سے ہو چکا ہے اس وجہ سے دو نمازیں باقی رہ گئیں۔ ایک ظہر جو سورج کے سجود کے پہلے مرحلے کے بعد ہے اور دوسری مغرب، جو اس کے سجود کے آخری مرحلے کے بعد ہے۔ گویا اس آیت میں ان تمام اوقات کی طرف اشارہ ہے جن میں ہماری پانچوں نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم سے انہی اوقات کی ضابطہ بندی فرما دی۔

یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہم ہر جگہ اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں، یہاں نظائر نقل کرنے میں طوالت ہو گی۔ قارئین کے اطمینان کے لیے صرف ایک آیت سورۂ طٰہٰ کی ہم نقل کرتے ہیں جس میں یہ سارا مضمون نہایت واضح الفاظ میں آ گیا ہے۔ فرمایا ہے۔

فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِہَا ۚ وَمِنۡ اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّہَارِ (۳۰)	پس جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرتے رہو اس کی حمد کے ساتھ، سورج کے طلوع سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے اطراف میں۔

'اطراف النھار' کے الفاظ کے مضمرات کی وضاحت سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں ہو چکی ہے تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے [2]

وَاسۡتَمِعۡ یَوۡمَ یُنَادِ الۡمُنَادِ مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ (۴۱)

'استماع' کے معنی توجہ سے کان لگائے رکھنے کے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس دن کو جھٹلاتے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحات ۷۷۳-۷۷۴

[2] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد چہارم، صفحات ۲۴۴-۲۴۵

ہیں تو جھٹلانے دو، تم ان کی باتوں کی پروا نہ کرو۔ بلکہ اس منادی کی آواز سننے کے لیے برابر کان لگائے رکھو جو نہایت قریب کی جگہ سے پکارے گا۔ اس منادی سے مراد وہی 'نفخ صُور' کا منادی ہے جس کا ذکر اوپر 'وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ' کے الفاظ سے ہو چکا ہے۔ 'مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آج تو ان غافلوں کو یہ باتیں بہت دُور کی اور نہایت ہی بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں لیکن اس دن ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ گویا اس کے کانوں ہی میں پکارا جا رہا ہے۔ یہ اسلوب کلام بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ دُخان میں 'فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ' (۱۰) ہے۔ اس سے مقصود ایک تو واقعہ کی قطعیت اور اس کی ہولناکی کا اظہار ہے، دوسرے اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ اس کے ظہور کا وقت آیا ہی سمجھو، معلوم نہیں کب منادی پکار دے۔

آیت میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور یہ خطاب نہایت بلیغ ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر یہ بلید لوگ اس عظیم ساعت سے نچنت ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ تم ہر لمحہ اس کے ظہور کے انتظار ہی میں رہو۔ قیامت کے معاملے میں ایک عاقل کو جس طرح چوکنا رہنا چاہیے یہ آیت اس کی صحیح تصویر ہے۔ اوپر آیت ۱۹ میں یہ مضمون بیان ہو چکا ہے کہ اس کو ہر شخص اپنے سر پہ کھڑی ہی سمجھے۔ یہ ہر آدمی کی موت کے ساتھ ہی لگی ہوتی ہے اور موت نہ معلوم کس گھڑی آ دھمکے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو اس کو بہت بعید سمجھتے ہیں۔

يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ (۴۲)

یہ 'يَوْمَ' اوپر والے 'يَوْمَ' سے بدل ہے۔ اور 'صَيْحَة' سے مراد نفخ صُور کا صیحہ ہے۔ 'حق' سے مراد، جیسا کہ آیت ۱۹ میں وضاحت ہو چکی ہے، قیامت ہے۔ اس لفظ سے اس کی تعبیر اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک اٹل حقیقت اور شُدنی ہے۔

فرمایا کہ اس دن کی صدائے صُور کے لیے برابر کان لگائے رکھو جس دن یہ تکذیب کرنے والے اس کی چیخ، اس شُدنی کے ظہور کی منادی کی حیثیت سے سنیں گے۔ وہ دن ان کے قبروں سے نکلنے کا ہوگا۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (۴۳)

یہ اس خروج کی دلیل بیان فرما دی کہ ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، تو ہمارے لیے ان کو دوبارہ زندہ کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ یہ دلیل اوپر وضاحت سے بیان ہو چکی ہے۔

'وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ' یہ اسی اوپر والی آیت کا ایک اور واضح نتیجہ سامنے رکھ دیا کہ جب ہم ہی

زندگی بخشنے والے اور ہم ہی موت دینے والے ہوئے تو اس سے نہ صرف یہ بات لازم آئی کہ ہم دوبارہ زندہ کر دینے پر بھی قادر ہیں بلکہ یہ بات بھی لازم آئی کہ سب کی واپسی بھی ہماری ہی طرف ہوگی۔ اگر کوئی اس مغالطہ میں مبتلا ہے کہ قیامت ہوئی تو اس کے مزعومہ شرکا و شفعاء اس کے کام آنے والے بنیں گے تو یہ مغالطہ وہ اپنے ذہن سے نکال دے۔ جن کو زندگی کے معاملے میں کوئی دخل نہیں، جو موت کے معاملے میں کوئی اختیار نہیں رکھتے وہ آخرت میں ملجا و ماوی کس طرح بن جائیں گے!

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ (۴۴)

قیامت کے دن قبروں سے نکلنے کی تصویر

یہ اس دن لوگوں کے قبروں سے نکلنے کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ نفخ صُور کے بعد زمین ان کے اوپر سے پھٹ جائے گی اور وہ اس سے نہایت تیزی سے نکلتے ہوئے ہوں گے۔ 'سِرَاعًا' ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ اس تیزی سے نکلنے کی تصویر قرآن کے دوسرے مقامات میں اس طرح کھینچی گئی ہے کہ جس طرح پتنگے اور ٹڈیاں نکلتی ہیں اسی طرح لوگ قبروں سے نکلیں گے۔

'ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ' یعنی کوئی اس مغالطے میں نہ رہے کہ لوگوں کو زمین سے برآمد کرنے کے لیے کوئی بڑا اہتمام کرنا پڑے گا جو ہم نہیں کر پائیں گے یا اس میں بڑا وقت صرف ہوگا۔ یہ سارا کام چشم زدن میں چٹکی بجاتے ہوگا۔ یہ ہمارے لیے نہایت آسان ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۴۵)

اوپر آیت ۳۹ میں فرمایا تھا 'فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ' یہ لوگ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کو ہم خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم خوب جانتے ہیں تو تم کیوں غم کرو۔ معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ہم اس کا مداوا کریں گے۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔

'وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ' اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ تم ان کو مومن بنا دینے کے کام پر مامور کر کے نہیں بھیجے گئے ہو کہ یہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش تم سے ہو۔ تمہارا کام صرف لوگوں کو یاد دہانی کرنا ہے، وہ تم کرتے رہو۔ اگر یہ ایمان نہ لائے تو اس کا انجام یہ خود بھگتیں گے۔

جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوا اسی پر خاتمہ

'فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ' یہ اسی بات پر سورہ ختم فرمائی ہے جس سے اس کا آغاز فرمایا تھا۔ قرآن ہی کے ذکر سے یہ شروع ہوئی تھی اسی کی یاد دہانی آخر میں فرما دی کہ تمہاری ذمہ داری صرف تذکیر ہے اور تذکیر کے لیے یہ قرآن کافی ہے تو اسی کے ذریعہ سے ان لوگوں کو یاد دہانی کر دو جو میری وعید سے ڈرنا چاہتے ہیں۔ جو نہیں ڈرنا چاہتے اور تمہاری تصدیق

کے لیے تم سے کسی عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کو ان کی تقدیر کے حوالے کر دو۔ وہ اس کا انجام دیکھ لیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس سورہ کی تفسیر ان سطور پر تمام ہوئی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد
۱۸ر جنوری ۱۹۷۷ء
۲۷ر محرم الحرام ۱۳۹۷ھ